2ND EDITION

ہماری ویب ڈیجیٹل بک

منیر بن بشیر

MUNIR BIN BASHIR

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Munir Bin Bashir "
at Hamariweb.com

کتاب اللہ - ذات والا صفات

حافظ محمد سید عبدالودود ذاکر علیمی کی کتاب "اللہ- ذات والا صفات" میرے سامنے ہے- جب یہ کتاب پڑھنے کے لئے دی گئی تو میں نے نیم دلی سے اسے قبول کیا- وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے دقیق موضوع پر قلم اٹھانا ھر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن ایک بھیڑ چال لگی ھوئی ھے اور بغیر سوچ سمجھے بہت سے افراد اس میدان میں خامہ فرسائی کے لئے کود پڑتے ھیں اور بعد میں اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکتے بلکہ قاری کو بھی الجھنوں میں ڈال دیتے ھے -- لیکن یہ پہلی مرتبہ ھوا کہ کتاب پڑھنا شروع کی تو چھوڑنے کو دل نھیں چاہا اس کتاب میں اللہ کی صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن انداز ایسا ہے کہ کسی بھی لمحے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا-

اس میں ادبی چاشنی بھی ہے تو صحافت کی فنکاریاں بھی ہیں اور کالم نویسی کے انداز نظر بھی- اس کتاب کو پڑھنے کے دوران عبدالودود ذاکر علیمی کہیں بلند پایہ ادیب کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کہیں اعلی وارفع کالم نویس لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے جناب ودود صاحب اپنے اصل مقصد سے ہٹتے نہیں اور اپنی تحقیقات کا نچوڑ قاری کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں- اور قاری کو اپنا پیغام بڑی کامیابی سے پہنچا دیتے ہیں-

یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن پاک کی آیات کا ترجمہ کرتے وقت نہایت سادہ زبان اور عام فہم اردو استعمال کی ہے کہ قاری صرف الفاظ کی بھول بھلیوں میں ہی نہیں پھنس جائے بلکہ ان سے نکل کر سوچ کی وادیوں میں اتر جاتا ہے۔ اور ایک اچھے ادیب کا یہی کام ہے یہ بات بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے کہ فاضل مولف نے کسی دارالعلوم سے کوئی سند نہیں حاصل کی لیکن محض اپنے شوق اور تجسس کے جذبے کے تحت یہ سارا علم حاصل کیا ہے اور میرے نزدیک جو چیز شوق کے جذبے سے حاصل کی جائے وہ عام پروفیشنل تحقیق سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ بھی اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی جگہ شک کے پھول کو پھلنے کا موقع نہیں دیتے اور قاری ہر جگہ ۔حوالہ' کو پاتا ہے'

ایک اعتراض جو علما کرام پر کیا جاتا ہے کہ انہیں جدید دور کی سائنسی معلومات سے آگاہی نہیں سو وہ کیا نئی نسل کو کیا مطمئین کر سکیں گے لیکن جناب عبدالودود صاحب نے کئی مقامات پر سائنسی تحقیقات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان میں اتنے دقیق مسائل لوگوں کو اس قدر دل نشین انداز میں سمجھانے کا فن کہاں سے آیا یہ سوال بار بار ذہن میں اٹھتا ہے۔ اگرچہ عبدالودود صاحب نے اس پر روشنی نہیں ڈالی لیکن کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حکومت کے مختلف تربیتی اداروں میں تربیت دینے سے منسلک رہے تھے جس نے ان کے اندر کے

چھپی ہوئی صلاحیت کو اور اجاگر کیا جس سے انہوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یوں ایک بلند پایہ کتاب وجود میں آئی۔

اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آپ کو اللہ پر پورا بھروسہ ہو جائے تو اللہ کے ایمان کی راہ میں تمام چیزیں بے توقیر ہو جاتی ہیں۔ جب وہ اللہ کی صفات کا تذکرہ کرتے ہیں تو صرف قرآن تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو تصورات ہیں ان پر بھی روشنی ڈال کر ہمارے یقین کو مزید مستحکم و محکم بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

دانش گاہ علیمی کتاب کے ناشر ہیں، R-28 بفرزون کراچی 15-3 سیکٹر۔

فون نمبر-- 021 36960584

ایک نٹ بولٹ کا زیادہ سے زیادہ وزن کیا ھوگا

نٹ بولٹ : آج کے دور میں ہر فرد نے کسی نہ کسی صورت میں نٹ اور بولٹ کا استعمال کیا ھے ۔ کبھی موٹر سائیکل خراب ھو گئی تو پتہ چلا کہ ایک نٹ بولٹ نکل گیا ھے اور اس نٹ کھٹ-- بولٹ نٹ -- نے پکنک جانے کا مزا کر کرا کر دیا ھے۔ کبھی سائیکل کے نٹ یا بولٹ میں مسئلہ آگیا اور بچے نے شور مچا مچا کر ناک میں دم کر دیا ۔ ۔ طویل سفر پر جا رھے ھیں اور کوئی بولٹ ڈھیلا ھو گیا ۔ بس ویران علاقے میں کھڑی ھو گئی ۔ رات کا سناٹا اور ایسے میں نٹ ٹائٹ کرنے کی آوازیں--- اور آجکل کے ماحول میں ڈاکوؤں کا اندیشہ الگ قصہ مختصر ہر ایک کو نٹ بولٹ سے واسطہ ضرور پڑا ۔ لمبے والے حصے کو بولٹ کہتے ہیں اور سوراخ والے حصے کو نٹ -- آخر اتنے نٹ بولٹ آپ نے دیکھے ہیں آپ کے خیال میں نٹ بولٹ کا زیادہ سے زیادہ وزن کتنا ھو سکتا ھے ۔ آدھا کلو ایک کلو بہت سے بہت پانچ کلو۔ لیکن انجینیرز جو بھاری صنعتوں میں کام کرتے ہیں ان سے پوچھیں کہ کتنا وزن ھو سکتا ھے ۔ جب اسٹیل مل میں کام کرنے والے ایک انجینیر نے بتایا کہ اس کے کارخانے میں ایک نٹ بولٹ ایسا بھی تھا جس کا وزن ایک ٹن تھا تو میں ششدر رہ گیا "صرف ایک بولٹ کا وزن ایک ٹن ! یعنی دس کلو والی سو بوریوں کے برابر۔ میں تو ایک بوری نہیں اٹھا سکتا --اسے کیسے اٹھاتے ھوں گے ؟" میں نے حیرت سے پوچھا "کرین کے

ذریعے "اس کے بعد انجینیر صاحب اس کے لگانے کے طریقوں پر بحث کرنے لگے -- اور میں بھاری صنعتوں میں کام کرنے والوں کے لئے دعائیں کرتا ھوا ایک انچ کے بولٹ کو دیکھنے لگ گیا جو میرے گھر کے پانی کے پمپ میں لگتا تھا اور جس کے خراب ھونے کے سبب میں دو دن سے پانی سے محروم تھا -- "اچھا اس بولٹ کی لمبائی کیا تھی "اس دکان کی اونچائی کے برابر اب دکاندار کی حیران ھونے کی باری تھی لیکں وہ شو نہیں کرنا چاہتا تھا- سو وہ لاپرواہی سے کھڑا رہا لیکن میں حیرت زدہ ہی رہا-- جانے آپ حیران ھیں یا نہیں

بھارتی وزیر اعظم شاستری کی عظمت کے پہلو

کوئٹہ میں 1950 1970 کے عشرے کے مشہور و معروف ڈاکٹر جناب محمد ایوب اپنی خود نوشت داستان "یعقوب اور آل یعقوب خاندان" مطبوعہ 1973 میں بھارت کے وزیر اعظم شاستری کی عظمت کے مخفی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں اسے پڑھ کر تو مین دنگ رہ گیا

وارث شاہ کی ھیر میں ایک شعر ہے

ھیر اکھیا جھوٹ بولئے -- ساہنوں کوئی نہ ملیا جیھڑا بچھڑے یار ملاوے

ترجمہ -- ہیر نے کہا اے جوگی تو جھوٹ کہہ رہا ہے - مجھے کوئی ایسا فرد اس جہان (میں نہیں ملا جو بچھڑے محبوب کو ملادے اور میں اسے ہمیشہ ترمیم کرکے پڑھتا ہوں

ساہنوں کوئی نہ ملیا جیھڑا ساہنوں ایس طرح کام آوے

(ترجمہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جو مجھے اس طرح کام آئے)

لیکن یہ کتاب پڑھ کر میں سوچتا ہوں میں غلط کرتا تھا

ایک اطلاع آئی تھی کہ چیف جسٹس کے بیٹے نے نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں کچھ نا مناسب طریقے اختیار کئے ہیں اس کے بعد موجودہ نگران وزیر اعظم کے فرزند ارجمند کے بارے میں بھی ایسی ہی خبریں اخبارات کی زینت بن رہی ہیں اور میرے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے
ساہنوں کوئی نہ ملیا جیہڑا ساہنوں ایس طرح کام آوے

-- میں سوچتا ہوں پاکستان 'بھارت' بنگلہ دیش سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں
- لیکن یہ کتاب اس سے مختلف کہتی ہے
صفحہ 284 پر کتاب کہتی ہے کہ -
مئی 1966 میں جب شاستری وزیر اعظم بنے تو اسوقت ان کے فرزند اکبر ہری کشن ممبئی کی ایک فرم میں چھ سو ساٹھ سو روپے ماہ وار پر ملازم تھے - اس فرم نے

شاستری کے وزیر اعظم بنتے ہی اکبر ھری کش کے عہدے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ---
- معاوضے میں بھی ---یک بیک - گراں قدر اضافے سے بہرہ ور کردیا

آنجہانی شاستری کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے صاحبزادے کو بلایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس فرم میں پہلی والی تنخواہ پر کام کرو یا ملازمت سے استعفٰی دے دو
-

شاستری کی اہلیہ کا بیان ہے کہ جب انکی بڑی بیٹی کی شادی ہوئی تو انھوں نے اپنی گاڑی بیچ
- کر اخراجات پورے کئے

ایک مرتبہ شاستری کو لندن کی کسی سفارتی مہم کے لئے نامزد کیا گیا-- شاستری کے پاس لندن کی سردی سے بچنے کے لئے گرم اوور کوٹ نہیں تھا- نہرو نے اپنا کوٹ دے
- دیا

- شاستری نے کوئی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ نہیں چھوڑی تھی

ڈاکٹر ایوب روزنامہ نوائے وقت 15-1-1966 کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس چھوٹے سے قد کے آدمی میں اللہ تعالی نے ذہانت اور انتہائی دیانت داری کا

مادہ ودیعت کیا تھا۔

ڈاکٹر ایوب صاحب مزید کہتے ہیں کہ یہ مضمون پاکستان کے مختلف رسائل نے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔

یوم مئی - ایک دوسرا پہلو

یوم مئی کو جب مزدوروں کی حمایت میں مضامین دیکھتا ھوں تو مجھے وہ سارے زخم یاد آجاتے ہیں جو ان مزدوروں نے دیئے۔

سوچتا ھوں کہاں سے شروع کروں۔

کیا وہ قصہ بتاؤں کہ قوم کے اربوں روپے کی ایک بھٹی پانچ منٹ میں ختم ھو کر خاکستر ھونے والی تھی۔ میں ایک کرین کے چلانے والے سے کہہ رہا تھا کہ اس کرین کو چلاؤتاکہ میں بھٹی بچاسکوں اور وہ کہہ رہا تھا کہ نہیں --- ذھن پر ایک پریشانی تھی اور اس کرین والے نے نئی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ میں نے روتی صورت بنا کر التماس کے انداز میں صرف ھاتھ نہیں جوڑے باقی چہرے پر جو مسکینی لا سکتا تھا لیکر آیا۔اور آخر کار مزدور کرین والے کو رحم آیا اور وہ کرین چلانے پر آمادہ ھوا۔ دل میں آتا ھے کہ پوچھوں کہ کس کے اوقات تنگ ہیں "بندہ مزدور کے یا بندہ انجینیر کے"

یہ دوسرا مزدور دیکھو۔ اچانک غائب ھوگیا۔ تین دن بعد آیا اور کہا کہ

مجھے حاضر قرار دیا جائے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بھئی تم اپنے گاؤں گئے ھو ۔جانے کیا کر کے آئے ھو کیسے حاضری لگا دوں۔ لیکن اس کی ضد تھی ۔اس کے ساتھ مزدوروں کے مسائل حل کرنے والی یونین بھی تھی۔ خیر اس اخباروں پر سونے والے مزدور نے حاضری لگوالی۔ دل کو ایک درد دے گیا۔ہے بہت تلخ اس بندہ مزدور کی یہ سوغات ۔۔ لیکن مسئلہ ختم نہیں ھوا۔ مہینے کے اختتام پر آیا اور کہا کہ اس غیر حاضری کا اوور ٹائم بھی لگاؤ۔ پھر ایک ھنگامہ شروع ھوا۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ انجینیر صاحب کو پیٹنے کی تیاریاں ھونے لگیں اور آخر مفت کا اوور ٹائم لگا کر نجات پائی۔ تو عادل و قادر ھے مگر ۔کب ملے گا افسر کو انصاف

یہ ایک اور افسر ہیں۔نہ جانے کیوں یکم مئی کو کیوں ان کے سر میں درد ھو جاتا ھے ۔ شاید کسی مزدور کی بد دعا لگی ھے۔ آج تو ان سے پوچھ کر رہیں گے ۔ چلیں اللہ کا شکر ھے آج کچھ بولنے پر آمادہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ کئی برس پہلے یکم مئی کو کسی الیکٹریشن کا انتقال ھوگیا تھا۔اس کی تدفین کے موقع پر گئے۔ ادارے کی طرف سے گاڑی نہیں دی گئی چنانچہ شہر میں چلنے والی وین میں اس زمانے کے مطابق پانچ روپے دی کر پہنچے ورنہ مزدوروں کی طرف سے پھر شور مچتا کہ صاحب کو مزدوروں کا غم نہیں۔ یہ افسر اپنے زمانے کے بہترین طالب علم اور تقریری مقابلوں میں اول آتے تھے۔ اتنے میں مزدور انجمن کا

نمائندہ بھی آ پہنچا۔ اس کو ادارے کی طرف سے گاڑی ملی تھی اور ڈرائیور بھی ۔
تعزیت کے بعد روانگی ھوئی۔ افسر صاحب ویسے ہی ایک عام پبلک کی گاڑی میں سوار
ھوئے۔ کنڈکٹر نے اعلان کیا "صاحبان۔ گرمی بہت ھے۔آپ کے لیئے آ للہ نے وین کی
چھت بنائی ھے جان ھے تو چلے جائیں۔ افسر تو نہیں گئے۔ لیکن دوسرے لوگ چلے گئے۔
راستہ میں مزدور رھنما کی گاڑی نظر آئی۔افسر صاحب نے سر اپنی وین سے باہر نکالا
ھوا تھا کہ ٹھنڈی ھوا آتی رہے۔ مزدور رھنما نے ان کو دیکھ کر ھاتھ ہلایا۔ اس کے بعد
یہ افسر سر اندر کرنے لگے تو نہ جانے کیسے وین والے نے.بریک لگائی کہ ان کے سر کو
چوٹ لگ گئی ۔

وہ سہانا سفر

کراچی سرکلر ریلوے مین سفر کرنا بھی ایک مزے کی بات تھی
کیا کیا نظارے نہیں ہوتے تھے سرکلر ٹرین میں
اتوار کا دن تھا۔ موسم سہانا تھا۔ سوچا کہ اپنے ایک دوست کو ملیر کینٹ مل آتے ہیں۔
یونیورسٹی کے اسٹیشن سے سرکلر ٹرین میں سوار ہوا۔
جب بوگی میں سوار ہوا تو زیادہ رش نہیں تھا۔ ایک خان صاحب موٹے سے غالباً پختون خوا یا بلوچستان سے تعلق تھا اپنی سیٹ پر نیم خوابیدگی کی حالت میں سوئے ہوئے تھے۔
اتنے میں ایک سرمہ بیچنے والا بھی اندر داخل ہوا۔ پہلے تو سب کو زوردار آواز میں سلام کیا۔۔ اس کی آواز سے وہ بیدار ہو گئے اور سرمہ بیچنے والے کو دیکھنے لگے۔ سرمہ بیچنے والے نے زوردار سلام کے بعد سلام کے بارے میں کچھ احادیث سنائیں۔ پھر کہا کہ خوشبو لگانا بھی ایک سنت ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اس کے آبا و اجداد۔۔ مغل شہزادی نور جہاں کے بہت قریب تھے مزید یہ

کہ نور جہاں اور اس کے آبا و اجداد عطر بنانے کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے۔ یہ تو قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ آج شرفاء اور ھنر مند خوار ہیں وغیرہ وغیرہ--- بعد میں اپنے عطر کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور بیچنے لگے۔ انھوں نے اسے کسی کے کپڑوں پر لگانے کی پیش کش کی۔ ان خان صاحب نے اپنی ٹوپی پیش کی اور اسے خوشبو سے معطر کرلیا

پوری بوگی میں بھی خوشبو سے پھیل گئی۔ عطر بیچنے والے صاحب اپنا عطر بیچا اور اگلے ۔ اسٹیشن پر اپنی اگلی منزل یعنی دوسرے ڈبے کی طرف روانہ ہوگئے

ابھی ٹرین چلنے والی ہی تھی ایک اور خوانچہ فروش شعر پڑھتے ہوئے داخل ہوئے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے---- وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

صاحبان قدر دان مہربان۔ یہ سرمہ ہے کوہ طور کے پتھروں سے بنا آپ کے شان شایان۔ اسے عینک توڑ سرمہ بھی کہتے ہیں کیونکہ اسے لگانے سے نظر صحیح ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں کسی قسم کا جالا ہو اس کے استعمال سے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایک سلائی ابھی لگائیں اور ابھی اس کے اثرات دیکھیں۔ یہ کہہ کر سرمے کی سلائی تلوار کی طرح ہوا میں لہرائی۔ خان صاحب نے اپنے کو پیش کیا

اور سرمہ لگا کر تھوڑی دیر تک آنکھیں موند کر بیٹھے رہے پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں
-

کیوں صاحب چودہ طبق روشن ہو گئے یا نہیں
- ایک مسافر نے تبصرہ کیا لیکن خان صاحب مسکرانے لگے
سرمہ بیچنے والے نے بھی اپنا کاروبار کیا اور اگلے اسٹیشن پر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے -
- شاید میں سرمہ لگا لیتا تو مجھے نظر آجاتے

چند مسافر اترے اور اس سے زیادہ سوار ہوئے- شاید شاہ فیصل کالونی (اس زمانے میں ڈرگ کالونی کہلاتا تھا) کا اسٹیشن تھا- ان مسافرون کے ہمراہ دانتوں کو صاف کرنے والی دوا بیچنے والے ایک صاحب لال بوتلیں ہاتھ میں سنبھالے داخل ہوئے- آتے ہی ایک مختصر مگر جامعہ لیکچر دانتوں کی صفائی کے بارے مین دیا- حاضرین کو سمجھانے ان کے پاس دانتوں کی تصاویر بھی تھیں-ان کی آفر بھی تھی کہ کوئی صاحب ٹیسٹ کرنا چاہتے ہیں تو لگا کر ٹیسٹ کر لیں-- انکی وہ پیشکش صرف اسی روز کے لئے تھی-- خان صاحب شاید ایسے کاموں کے لئے ہمیشہ دل و جان سے سے اپنی خدمات پیش کرتے تھے- پھر آگے بڑھے اور دوا لگالی -- دانت ایک دم موتیوں کی طرح چمکدار ہو گئے- اس
- کے بعد میں کیا اثرات ہوں گے وہ اللہ پر چھوڑ دیے

- ٹرین چلی جا رہی تھی چھکا چھک

اگلا اسٹیشن آیا -- چشم بوگی نے ایک نیا نظارہ دیکھا - اب کے ایک چہرے کو لگانے پاؤڈر بیچنے والا داخل ہوا اور پاؤڈر کی جملہ صفات پر کماحقہ روشنی ڈالی - اور یہ بھی کہا کہ کوئی صاحب لگا کر دیکھنا چاہتے ہوں تو دیکھ لیں -

خان صاحب -- اب ہمیں دیکھنے لگے - چہرے پر کچھ شرماہٹ بھی آئی اور تذبذب کا شکار بھی دکھائی دیے - ہم نے نظروں میں حوصلہ افزائی کی - سو خان صاحب بے وہ بھی لگالیا -

ایک صاحب جو ساتھ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہا لگا لو لگا لو - ابھی سولہ اسٹیشن باقی ہیں آخری اسٹیشن تک سولہ سنگھار پورے ہو جائیں گے -

گاڑی پھر چل پڑی --- اب رش بڑھ گیا تھا - کچھ لوگ کھڑے بھی تھے - ایک بوڑھے سے صاحب جن کے ایک ہاتھ میں پان دان تھا وہ دوسرے ہاتھ سے چھت کے ڈنڈے کو پکڑے بڑی مشکل سے کھڑے ہوئے تھے - ان کی کوشش تھی کہ پان دان کو ہچکولے نہ لگیں - انکی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کیا کریں - خان صاحب کی نظر ان پر

پڑی --ان کی عمر کا اندازہ کیا ایسے لگا انہیں کرنٹ لگا-ایک دم اٹھے اور اپنی نشست ان کو

پیش کی ---- بیٹھو بیٹھو-- کینا کینا--ہم جوان آدمی ہے تم بیٹھو-

مسافر جو اب تک تمسخر سے دیکھ رہے تھے ششدر رہ گئے

سارے ڈبے کو سانپ سونگھ گیا تھا

یہ میں ٹائپ کر رہا ہوں اور میرے سامنے اب بھی خان صاحب کی تصویر پھر رہی ہے

اور اس کے ساتھ ہی ششدر لوگوں کے چہروں کی بھی-

کیا ڈے آف ججمنٹ کو ایسا ہو گا

یہ ملک کے بہت بڑے صنعتی ادارے کا آڈیٹوریم تھا ایک لیکچر جاری تھا۔ چیف ایگزیکٹیو آفیسر جو کہ گریڈ 22 کے افسر تھے لیکچر دے رہے تھے۔ اچانک ایک سینئر آفیسر نے کچھ اونگا بونگا سوال کر دیا۔ عجیب سا سوال تھا۔ اس کا اس لیکچر سے براہ راست تعلق بھی نہیں بنتا تھا۔ ہم سب ایک دم سکتے میں آ گئے۔ سی ای او کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن پھر ضبط کر کے "ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا سوال ہے تمہارا۔ کیا بولنے کا بہت شوق ہے۔ چلو بیٹھ جاؤ اور وہ صاحب بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک انجینئر جو کہ نہایت جونئیر پوسٹ پر تھا اس نے اس نے ڈرتے ڈرتے ایک پوائنٹ کی طرف توجہ دلائی۔ یہ نکتہ اہم تھا۔۔ سی ای او نے اس پر مزید روشنی ڈالی۔

لیکن میں سوچوں میں ڈوب گیا۔ کیا ڈے آف ججمنٹ کو بھی ایسا ہی ہو گا

ہم میں سے کئی افراد جو اس دنیا میں اپنے کو نیک پارسا بنائے ہوئے رہتے ہیں

ان کے بھرم کھل جائیں گے اور غیر معروف افراد اللہ کی بارگاہ مین اونچا درجہ پائیں گے
-

ایک بیش قیمت گاڑی میں بیٹھی ہوئی خاتون کو جھاڑ پلادی جائے اور ایک ٹیکسی ڈرائیور کی ماں کو اونچی مسند پر بٹھادیا جائے

فرزانہ اعجاز لکھنو کی ایک ادیبہ ہیں۔ ان کی کئی کتب چھپ چکی ہیں ان میں سوانح حیات بھی ہیں اور خود نوشت بھی اور سفر نامے بھی۔ آج کل مسقط میں قیام پذیر ہیں

اپنی ایک کتاب " بیس کہانیاں " مین ایک واقعہ سیدھ سادے انداز میں " قطب ستارہ کے عنوان سے رقم کیا ہے۔ انھوں نے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔۔ کوئی تجزیہ بھی نہیں " کیا۔ پاکستان کا صرف ایک قصہ لکھا ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور کی مان کو پتہ چلا کہ اس کا بیٹا کسی مسافر کا سامان گھر لے آیا ہے تو ماں گھر سے باہر بیٹھ گئی کہ اس گھر کا رزق اور رہائش میرے لئے حرام ہے۔ اور ٹیکسی ڈرائیور کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر مسافر تلاش کرنا پڑا فرزانہ صاحبہ نے قصہ ختم کیا اور مجھے سوچ کی گھاٹیوں میں چھوڑ گئیں۔ کیا

ڈے آف ججمنٹ کو ایسا ھوگا کہ ہم میں سے کئی افراد جو اس دنیا میں اپنے کو نیک پارسا بنائے ہوئے رہتے ہیں ان کے بھرم کھل جائیں گے اور غیر معروف افراد اللہ کی بارگاہ میں اونچا درجہ پائیں گے -

ایک بیش قیمت گاڑی میں بیٹھی ہوئی خاتون کو جھاڑ پلادی جائے اور ایک ٹیکسی ڈرائیور کی ماں کو اونچی مسند پر بٹھادیا جائے -

چین -- مسلمانوں کے رویوں کی تخلیق نو

ایثار الکاتنی مصر سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ سعودی عرب میں پیدا ہوئیں اور پھر مصر آگئیں پچیس برس کی عمر میں ہی انہوں نے مصری اور بین الاقوامی حلقوں میں بطور صحافی۔ مصنف / لکھاری۔ تجزیہ نگار اپنا لوہا منوالیا ہے۔ چین کی سیاحت کو گئیں تو چینی مسلمانوں کے بود و باش کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور یہ جائزہ اپنے مضموں اسلام ان چائنا میں سیدھے سادے الفاظ میں رقم کردیا۔

اس مضمون پڑھنے کے بعد تو مجھ پر حیرتوں کے کئی جہاں طلوع ہوئے اور میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ چین کی سوچ کہاں ہے اس تک تو ہمارے ہاں کوئی پہنچا ہی نہیں۔

دوسری جانب اس چینی اشتراکی معاشرے میں مسلمان اپنے رویوں کی تخلیق نو کرکے کیسے اپنی ناؤ آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ پڑھتا گیا اور غور و فکر کے کئی در وا ہوتے رہے

قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مضموں کا خلاصہ اور ترجمہ پیش کیا جاتا ہے

ایک اندازے کے مطابق چین مین مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ جو کہ برطانیہ کی آبادی کا ایک تہائی ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ نہیں بلکہ دس کروڑ ہے۔ چین مین اسلام کی تاریخ اتنی ہی پرانی جتنی عرب میں اسلام کی تاریخ۔ پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والسلم اسلام کے وصال کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالی کے دور چین سے سفارتی تعلقات قائم کئے گئے تھے۔اور اسی سال یہاں مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۔اور تقریباً سو سال بعد مسلمان ان کی فوج کا حصہ بھی بنے یہ ایک حیرت کی بات ہے کہ مسلمانون کے اپنے درمیان کسی قسم کے باہمی اختلافات نہیں ہیں۔ اگر کچھ فرق بھی ہے تو وہ ان کے رہنے سہنے کے انداز۔زبان۔ ۔خوراک۔ اور روایات میں ہے۔ ہاں البتہ یہ بات ہے کہ مسلمان کو ابھی سیاسی امور میں حصہ لینے پر کچھ دشواریان ہین جس کا سبب یہ ہے کہ چین میں اب بھی لادین افراد کو زیادہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کے معاشرہ میں ضم ہونے کے لئے کسی اقدام سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

مسلمانوں نے چینی زبان۔ چینی طرز لکھائی اور دیگر ثقافتی امور پر پورا عبور حاصل کر لیا ہے کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ ہمیشہ

-دیگر گروہوں یا آبادیوں سے جدا ہوجاتے جو کہ خود ان کے لئے فائیدہ مند نہیں ہوتا
چین میں مسلمان مساجد کی تعمیر چین کی تعمیراتی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں مثلاً بیرونی طور پر پگوڈا ٹائپ کی چھتیں- چینی خطاطی- چینی طرز کے محراب وغیرہ لیکن اندر جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اندر سے اسلامی تشخص برقرار رکھا ہوا ہے یعنی وہی ہشت پہلو مینار- وہی عربی خطاطی -وہی مخصوص محراب وغیرہ-ایسے علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں کے بازاروں میں احادیث پر مشتمل دیواروں پر لٹکانے والی تختیاں اور ھینگنگ فروخت کے لئے نظر آتی ہیں-اسی طرح چینی ثقافتی ظروف اور برتن بھی نظر آتے ہیں جن پر قرآنی آیات تحریر ہوتی ہیں-

چین میں آبادی پر قابو پانے کے لئے حکومت نے کئی اقدامات کئے ہین لیکن یہ اقدامات اور قوانیں سب پر یکساں لاگو نہیں ہوتے- بلکہ صرف ان آبادیوں اور گروپ پر لاگو ہوتے ہین جنکی آبادی زیادہ ہے مثلاً ہوئی گروپ پر یہ پابندی عائد ہے لیکن دوسرے گروہوں کی آبادیاں جن میں افراد کی تعداد کم ہے وہاں یہ قانون نہین نافذ کیا گیا انہیں دو بلکہ تین بچے بھی پیدا کرنے کی اجازت ہے- جن گروہون کو یہ مراعات ملی ہیں ان میں مسلمانوں کے گروہ یا آبادیاں بھی

- شامل ہیں

اس وقت چین میں مختلف لحاظ سے آبادیوں کے پچپن گروپ ہیں - ان گروپوں میں دس گروپ ایسے ہیں جن میں مسلماں شامل ہیں - ان دس گروپوں میں ایک گروپ ہوئی یا ہوئی ژو گروپ ہے جو کہ ایک کروڑ کے قریب ہے Hui--OR --- Huizhou یوئی غرکا ہے جس میں Ui Ghur یعنی مسلمان آبادی کا پچاس فیصد - دوسرا بڑا گروپ - مسلمان اکتالیس فیصد کے قریب ہیں -- ہوئی گروپ چینی بولتا ہے جبکہ باقی ماندہ ترکی زبان - اس تجزئے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہوئی مسلمان وہ ہیں جو ثقافتی تمدنی اور زبان دانی کے لحاظ سے اصل چینی ہیں باقی نہیں - یہ ہوئی مسلمان مختلف صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں یہ چینی معاشرے پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھے بلکہ ماضی میں تو مملکت چین - کے تمام امور مملکت میں حصہ بھی لیتے رہے تھے

منگولوں کے دور میں انہیں پہلی مرتبہ ایک نیا مسئلہ درپیش آیا تھا - جب منگولوں نے تیرھویں صدی مین چین پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کو بیرونی قرار دیا اور اسی سماجی حیثیت کے ساتھ رہنے کی اجازت دی - ماوزے تنگ کے بعد کے ادوار میں ہوئی گروپ کی معاشی قوت کا اندازہ لگاتے ہوئے نئی مملکت نے انہیں خصوصی مراعات دین - اب معاملات کا رخ بدل چکا ہے - حکومت نے ہر ایک کو اپنے

مذہب پر عمل کرنے کی کچھ آزادی دیدی ہے۔

کولپور بلوچستان

کوئٹہ سے سندھ کی طرف جاتے ہوئے پہلی سرنگ آنے کے فوری بعد جو قصبہ آتا ہے
وہ ہے کولپور
اسٹیشن پر روایتی اسٹیشنوں کا شور غل نہیں۔اونچے پہاڑوں کے دامن میں بنا یہ صاف
ستھرا چھوٹا سا اسٹیشن --جی چاہتا ہے کہ کھڑے ہوکر چاروں طرف نظریں ڈالتے رہیں
اور دل میں ایک سکون---- ایک اطمینان---- ایک راحت---اتارتے رہیں۔ اس
کے اسٹیشن پر کھڑا ہوکر تو میں سرور آمیز سحر میں کھو جاتا ہوں
پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر نیچے نگاہ ڈالیں تو بل کھاتی کولتار کی سڑک پر ٹرک ایک
عجب سی موسیقی بکھیرتے ہوئے چلتے نظر آتے ہیں۔ ٹرک کے دور ہونے کے ساتھ
ساتھ آواز آہستہ آہستہ اوپر نیلی فضا اور پہاڑ کی چوٹیوں مین معدوم ہو جاتی ہے۔اسکے
بعد دوسرا ٹرک کہیں سے آتا ہے اور ایسے ہی موسیقی پھیلاتا ہوا سرنگ کے ساتھ سے
نکل جاتا ہے۔

سڑک کی دوسری جانب انگریزوں کے بنائے ہوئے ٹین کے خوبصورت صاف مکانات الگ سحر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ گاڑی اپنا قیام طویل کر لے لیکن گارڈ کی سیٹی پھر اس کا سبز جھنڈی ہلانا اور سب سے آخر میں انجن کے لمبے ھارن کی آواز مجبور کرتی ہے کہ ان سب نظاروں کو الوداع کہہ دوں۔

مسجد خورشید نیم شب

مساجد تو تعمیر ہوتی رہتی ھیں۔
کبھی کسی مندر کو ڈھا کر مسجد تعمیر کردی اور مندر کے بت کو زمین پر بچھادیا کہ لوگ اس پر پیر رکھ کر سفر کریں۔
کبھی اپنی ناجائز بلڈنگ کو بچانے کے لئے مسجد بنادی کہ اگر بلڈنگ ناجائز ہے تو مسجد بھی تو ناجائز ہے
لیکن کینڈا میں دائرہ قطب شالی سے بھی دو سو کلو میٹر اندر مسجد بنانا جس میں اس قسم کا کوئی ایسا جذبہ کارفرمانہ ھو حیرت کی بات ھے
اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات ہے کہ مسجد کو اپنے اصل مقام انووک سے چار ہزار کلو میٹر دور منی توبہ میں تعمیر کیا گیا اور اسے بعد لین اسکے اصل جائے وقوع پر انووک منتقل کیا گیا۔ مسجد کا نام ھے مسجد خورشید نیم شب Midnight sun mosque

مسجد کے مینار پر چاند اپنی ہلالی صورت میں ایک عجب شان دکھا رہا ھے ۔
کینڈا کے انتہائی شمالی علاقے میں قطب شمالی کے قریب ساڑھے تین ہزار کے قریب مسلمان رہائش پذیر ہیں ۔جب مسجد بنانے کا مرحلہ آیا تو عراقی انجینیر نے تخمینہ لگا کر بتایا کہ اگر مسجد کی تعمیر کا کام اسی مقام پر کیا گیا تو بہت خرچ آیگا ۔اس کا بہترین حل یہ ہے کہ چار ہزار کلو میٹر دور منی توبہ کے مقام پر اس کے تعمیراتی مراحل کئے جائیں اور اس کے بعد اسے اپنے اصل مقام انو ویک ۔ منتقل کیا جائے ۔ اس سے تعمیراتی لاگت میں بہت کمی آجائی گی کیونکہ منی توبہ میں لیبر کاسٹ کم پڑے گی ۔ وہاں افرادی قوت سستی قیمت پر دستیاب ھو جاتی ہے ۔اس کے علاوہ تعمیراتی سامان بھی کم نرخوں پر مل جاتا ھے چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ مسجد کو منی توبہ میں تعمیر کرکے بعد میں اسے بذریعہ ٹرالر اور بحری جہاز مینی توبہ سے انووک منتقل کردی جائے ۔
یہ ایک عجیب منصوبہ تھا لیکن مسلمانوں کے عزم راسخ اور جہد مسلسل نے اسے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا ۔
اس کی تعمیر کے دوران اور منتقلی کے دوران طرح طرح کی مشکلات سے واسطہ پڑا ۔
ایک سو ستر مربع گز کی مسجد منی پیگ مینی توبہ میں تیار کرکے ایک ٹرالر

میں لوڈ کر دیا گیا۔ راستے میں خلیج رینڈیر پر بنا ہوا پل نے مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا جب پتہ چلا کہ ٹرالرکے ٹرک کی چوڑائی زیادہ ھے اور پل کی کم ہے۔ چنانچہ اس ٹرالر کے ٹرک کو نکال دیا گیا اور اس کی جگہ نیا ٹرک لے کر آئے۔ یہ بلاشبہ ایک دشوار کام تھا لیکن ہمت مرداں مدد خدا۔۔بڑی محنت و مشقت کے بعد کامیابی ہوئی اور راہ مین حائل اس دشواری سے بخوبی نکل گئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل ایک اور مرحلہ ایا جب سفر کے دوران مسجد اپنی جگہ سے کھسک گئی اور اس کے گرنے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ یہ بڑا ھی مشکل کام تھا کہ اسکو گرنے سے بچایا جائے کیوں کہ سفر کے دوران کسی کرین کی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے مسجد بالاخر بندرگاہ پہنچائی گئی۔ منزل ابھی دور تھی۔ابھی تو اسے ایک بہت بڑا قطعہ آبی پار کرنا تھا۔ اسے ایک چھوٹے بحری جہاز مین منتقل کیا گیا اور اسکا بحری سفر شروع ھوا۔ بحری سفر میں کیا مسائل درپیش آئے اس کی ایک الگ داستان ھے۔ 24 ستمبر 2010 کو سارے صبر آزما اور اعصاب معطل کرنے والے مراحل سے گزرے کے بعد مسجد اپنی منزل مقصود پر پہنچی ۔۔

کینڈا ایک بہت بڑا ملک ھے۔اس کے کسی دوسرے کونے میں رہائش پذیر کار پینٹر فتح اللہ کو پتہ چلا کہ قطب شمالی کے اس گاؤں۔انوویک_کے لوگون نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ھے تو وہ بھی اس کار خیر میں حصہ لینے اپنے خرچ پر

انو وک پہنچ گیا۔ اس نے مینار بنانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں ۔ فتح اللہ نے مینار بنانے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں اور نہایت قلیل عرصے میں دس میٹر بلند مینار بنا لیا۔ اس مینار کے اوپر ایک چاند ہلالی صورت میں آویزاں کر دیا مسجد کے اندر خواتین کی نماز ادا کرنے کے لئے الگ حصہ مخصوص کیا گیا ھے ۔ایک لائبریری بھی بنائی گئی ھے اور بچوں کے لئے کھلونوں کا انتظام کیا گیا ھے ۔

قطب شمالی میں واقع یہ مسجد اس بات کی گواہی دے رہی ھے کہ انسان کے اندر جذبہ ھو اور اللہ کی مدد شامل حال رہے تو تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں ۔

پاکستان ریلوے---ایک انجینئر نے یہ دیکھا

ضروری کام سے مچھ (کوئٹہ کے قریب ایک مقام) جانا پڑ گیا۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ مچھ کون سا دور ہے۔۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسی روز واپس آنا بھی تھا۔
خیر یہ فیصلہ کیا کہ جائیں گے ریل سے اور واپسی بذریعہ بس کریں گے۔ ٹرین اپنے وقت پر روانہ ھوئی (ہے نہ حیرت کی بات !!) میں گھر کے کپڑوں یعنی شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ سرنگوں سے گزرتے ہوئے۔ پلوں کو پار کرتے ہوئے۔ پہاڑوں کی پر پیچ گھاٹیوں کے اندر گھومتے ہوئے جب ٹرین نسبتاً کسی میدانی علاقے سے گزر رہی تھی کہ اچانک تڑاتڑ۔۔ قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں کھڑکی سے باھر جھانک کر باہر دیکھا تو حیران ہو گیا۔ ایک عجب نظارہ نظر آیا۔ ریل کی پٹری کے ساتھ جو پتھر پڑے ہوتے ہیں وہ بندوق کی گولیوں کی طرح دور دور جا رہے تھے۔ ایک پہاڑی بکرا اپنے ریوڑ سے دور کھڑا، اطمینان سے جگالی کرتے ھوئے ٹرین کو دیکھ رہا تھا۔ایک پتھر اسکی پیشانی پر لگا۔ پتہ نہیں وہ کونسی آواز نکالتا ھوا بگٹٹ دور بھاگتا چلا گیا۔ بکرے کی آواز اس لئے سنائی نہیں دی کہ ٹرین کی جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ سب پر بھاری تھیں

ایک صاحب جو باتھ روم میں تھے گھبرا کر باہر نکل آئے۔ان کی آنکھیں پھیلی ھوئی تھیں ۔ کیا ہے کیا ہے۔انھوں نے چلا کر کہا۔ باتھ روم میں زمین کو جانے وال پائپ سے پتھر آرہے ہیں معاملہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرھا تھا۔ اچانک اس آواز میں ایک اور آواز بھی شامل ہو گئی۔ "ٹن-- ٹن_ٹں" پھر ٹرین کی رفتار کم ھونے لگی۔اور باالآخر ٹرین رک گئی۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ باہر کوئٹہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ دور دور تک ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریلوے کے صاحبان اتر کر ہمارے ڈبے کی طرف آتے دکھائی دئے ۔

ادھر آؤ۔ ادھر سے آواز آتاپڑاھے " ایک صاحب نے کوئٹہ کے مخصوص لہجے میں " انہیں پکارا۔ میں بھی ادھر چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک بوگی کے نچلے حصے میں ایک آہنی تین انچ موٹا پائپ لٹکا ھوا تھا۔ اس پائپ کا دوسرا حصہ زمین سے چھو رہا تھا اور اسی سبب پتھر دور دور تک پھیل رہے تھے۔ ٹرین کے عملے نے عارضی طور پر اسے ایک تار کی مدد سے باندھ دیا اور گاڑی آگے روانہ ھوئی ۔

اگلا اسٹیشن نہ جانے کونسا تھا وہاں اس کا اسٹاپ نہی تھا لیکن گاڑی روک کر اس کی مرمت کا کام شروع ھوا۔ اب میں ذہنی تناؤ میں آگیا کہ واپس بھی ھونا تھا اور شام چھ بجے کے بعد کوئی بس نہیں ملتی تھی۔ مجھے پہنچنے کی جلدی

تھی -اس لئے عملے کی مدد کرنے کے لئے میں خود بھی بوگی کے نیچے چلا گیا- لیکن سپر وائزر نے آواز دی "آپ اوپر آجائیں" مجبوراً باہر آنا پڑا- بیس سال ایک بڑے صنعتی ادارے میں بھاری مشینوں کی مرمت کرتے کرتے اتنی تو شدھ بدھ ہو گئی تھی کہ اندازہ لگا سکوں مرمت کرنے والے ماضی میں مشین سے کیا برتاؤ کرتے رہے ہیں اور اب مشین مستقبل میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی- یہ پائپ غالباً بریک کا لیور تھا ایک جگہ سے کریک ہونے کے بعد ٹوٹ کر گر پڑا تھا - کریک کا جائزہ لینے سے اندازہ - ہوتا تھا کہ پرانا کریک ہے اور آج پرانا کریک اچانک بڑھا اور اس ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنا- پریمینٹیننس کا اصول یاد آیا کہ تین چار مشینیں اگر ایک ہی حالات اور ایک ہی ماحول میں کام کر رہی ہوں اور ایک جگہ اگر کوئی مسئلہ آیا ہے تو سمجھیں دوسری جگہ بھی ایسا ہی مسئلہ موجود ہوگا- اسی سوچ کے تحت دوسری بوگیوں کے نیچے جا کر دیکھا تو وہاں بھی - ایسے ہی کریک موجود تھے

میں نے سپر وائزر سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے جواب دیا " آپ لوگوں کو اچانک دست نہیں لگ جاتا - ایسے ہی ٹرین کو بھی ہو جاتا ہے

میں کہنا چاہ رہا تھا جناب آپ جب مرمت کی لاگ بک بھریں تو لکھیں کہ مستقبل میں ایسے بریک ڈاون سے بچنے کے لئے تمام بوگیوں کے بریک لیور کا جائزہ لے

- کران کی ویلڈنگ کا انتظام کریں

یوں بھی ٹکنیکل رپورٹ لکھنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ آخر میں تبصرہ کرتے ہوئے " بتایا جائے کہ " مستقبل میں اس قسم کے واقعات سے کیسے بچا جا سکتا ہے

- لیکن افسوس میری صدا مچھ کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ گئی

ان کو بچائیں

پاکستان میں سب سے زیادہ قدیم درخت کہاں ہیں ؟
لوگ جب شالامار باغ لاہور جاتے ہیں تو انہیں بتایا جاتا ہے یہ مغلیہ دور کے درخت ہیں۔ان کی شان دیکھو۔ ان کی آن دیکھو۔یہ مغل شہزادوں کے تیور سے بھی آشنا ہیں اور نازک شہزادیوں کی اداؤں سے بھی واقف ہیں۔ ایک جلوہ رنگین ان کی نگاہ میں ہے
پھر کوئی صاحب صدا لگاتے ہیں میاں سرگودہا چلو وہاں اس سے بھی زیادہ پرانا درخت تمھارا انتظار کر رہا ہے اور لوگ جو شہزادیوں کو اپنے سامنے تصور میں اٹکھلیاں کرتے دیکھ رہے ہوتے ہیں، غمشگیں نگاہوں سے اس پر نظر ڈالتے ہوئے خوابوں کی دنیا سے باہر آ جاتے ہیں۔
ضلع سرگودہا تحصیل کوٹ مومن ۔ گاؤں مڈھ رانجھا سے دو کلو میٹر دور واقع۔برگد کا پیڑ اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا قطر بہت زیادہ ہے لیکن یارو بلوچستان کے تفریحی مقام زیارت میں جونیپر کے درخت بھی تو کچھ کہہ رہے

ہیں - جونیپر کے یہ درخت کہہ رہے ہیں کہ ہم سب سے قدیم ہیں
چلو چلیں زیارت چلیں - انگور کھائیں ، چیری سے لطف اندوز ہوں - چشموں کا پانی پئیں اور قائداعظم کی رہائش گاہ کے باقی ماندہ آثار کی سیر بھی کر لیں -اور ہاں چائے بھی تو پینی ہے - ہوٹل کے باہر انگور کی بیل کے نیچے جو میز لگی ہوئی ہے وہاں بیٹھ جائیں سبز چائے کی ایک چسکی لگائیں اور اوپر موتیوں کی طرح لٹکے ہوئے سرخ سرخ - انگوروں کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب جائیں - فبای الاء ربکما تکذبن-- اللہ کی کس کس نعمت کا تم انکار کروگے

- اور اس کے بعد ان قدیم ترین درختوں کا حال چال بھی پوچھ لیں
یہ چار ہزار سال پرانے قدیم درخت سب زبانیں جانتے ہیں
کیونکہ یہ اس وقت بھی موجود تھے جب مصر میں فرعون اور اس کے سابقین اہرام مصر اور ابوالھول تعمیر کر رہے تھے - قلوپطرہ اپنے حسن پر نازاں تھی
انھوں نے 1700 سال قبل سکندر اعظم کو دنیا پر حملہ آور ہوتے دیکھااور اس کے - گھوڑوں کی چاپ سنی

بدھ مت کے مہاتما بدھ نے جب جنم لیا تو ان درختوں نے انہیں ویل کم کیا۔ اس وقت انکی عمر ڈیڑھ ھزار برس تھی۔

سوال کرنے کی ممانعت ھے لیکن ایک سوال زبان پر مچل ہی رھا ھے کہ انکی طویل العمری کا راز کس چیز میں پوشیدہ ھے۔ کہتے ہیں کہ ان درختوں کی بلندی سو سال میں تقریباً ڈیڑھ انچ بڑھتی ھے۔

ھم زیارت کے ان بزرگ درختوں کی قدر نہیں کر رہے اور انکو بطور ایندھن استعمال کرکے انہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔ سینئر سٹیزن کی طرح انہیں سینئر نباتات کہہ کر ان کے لئے کچھ کریں۔ انہیں ایک بیماری لگ رہی ہے اس سے بچائیں۔ حکومت پاکستان نے ان درختوں کی اہمیت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے خصوصی طور پر ڈاک کے ٹکٹ جاری کئے تھے

ایک شہید کی داستاں

میں نے انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد پہلی نوکری جو کی وہ پاکستان کے خلائی تحقیق کے ادارے سپارکو کی تھی ۔ جو راکٹ تیار کرنے کا واحد ادارہ تھا۔ اس میں انٹرویو ہوا اور میں باآسانی منتخب بھی ہوگیا۔ انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے کے دو ماہ کے اندراندر۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل افسردہ تھا۔ ایک کسک ۔ ایک خلش۔ ایک چبھن سی تھی جس نے مجھے کامیاب کرایا تھا وہ تو ٹھیک ایک سال، گیارہ ماہ قبل اس جہاں کو چھوڑ کر اللہ کے یہاں چلا گیا تھا۔ اس کا نام محمد مسعود تھا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔

میرا اس سے کیا تعلق تھا؟

وہ پاکستان کے شرقی صوبے سے تھا۔اور مین افغنستان کے قریب واقع شہر کوئٹہ سے حصول علم کے لئے لاہور پہنچا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی وہ میرے قریب

آتا گیا ہونہار ایسا تھا کہ جس چیز کا مطالعہ کرتا - پاتال کی گہرائی تک رسائی حاصل کرکے تمام اہم امور معلوم کرلیتا تھا - ذہین ایسا کہ ایک مرتبہ پڑھ لے تو تمام کی تمام باتیں ذہن نشین - میزائیل اور راکٹ اس کی ریسرچ کا بنیادی موضوع تھے -

وہ چاہتا تھا کہ پاکستان اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے- چنانچہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں اس نے عملی طور پر راکٹ بنانے کا ارادہ کیا - اور یہی سال آخر میں اس کی ریسرچ کا موضوع تھا- طرح طرح کی کتابیں اس نے جمع کرلیں - مختلف پیریاڈیکل منگوانے لگا

مجھ سے اس کی واقفیت زیادہ نہ تھی لیکن دو یا تیں ملاقاتوں ہی اس نے میزائیل سازی کی ساری باتیں ، اس کے آڑنے کے اصول ، اس کے اوپر ہوا کی رفتار کے مختلف اثرات ، اوران سے نبرد آزما ہونے کے طریقوں سے آگاہی کرادی- زمین سے زمین کو بھیجے جانے والے راکٹ - زمین سے فضاء میں جانے والے راکٹ ، ایک اسٹیج والا راکٹ /دو اسٹیجوں والا راکٹ سب کچھ اس نے مجھے گھلا کر پلادیا- یوں ہم قریب آتے گئے- میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ جس روز میں فضاء میں راکٹ چھوڑوں گا اس روز تم ضرور انا- میں نے حامی بھر لی -

اور جب میں وہاں پہنچا تو وہاں تباہی ہی تباہی تھی ۔اس کے کاغذات ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے ۔ بیٹری کی تاریں الجھی ہوئی نظر آئیں ۔ راکٹ کے خول کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے ۔ اور اس سے زیادہ ہیبتناک منظر ۔۔۔اف میرے اللہ ۔۔۔ جسم کے ٹکڑے ۔ تھے ۔

وہ راج شاہی میں اول آنے والا طالب علم ۔۔ وہ تحقیق کرنے والا دماغ ، وہ کتابوں کے صفحات کو دیکھنے والی آنکھیں ، وہ لیکچر کو نوٹ کرنے والے ہاتھ ، وہ ملک کے مستقبل کو چاند سے آگے لے جانے کے خواب دیکھنے والا ۔ راکٹ کے اندر کسی فنی خرابی کے سبب راکٹ کے پھٹ جانے پر اللہ میاں کے پاس چلا گیا تھا ۔ جسم کا ایک ٹکڑا دور سڑک کے ۔ پار مٹی مین لت پت پڑا تھا ۔ میں نے اسے اٹھایا اور اس کے جسم کے قریب کر دیا یہ اسی کے لیکچر تھے جو انٹرویو میں میری کامیابی کا باعث بنے تھے ۔ لیکن میری کامیابی کو ۔ دیکھنے کے لئے وہ موجود نہ تھا

لیکن جانے کیوں جب بھی سپارکو کا راکٹ اڑتا ۔اس کے دھوئیں میں اس کا چہرہ نظر آتا ۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ۔ مسرت سے مبارک باد دیتے ہوئے

- پاکستان کو۔۔۔۔اس کے انجینئروں کو۔۔

اللہ اس شہید کی روح کو اپنے رحمتوں سے سرشار کرے آمین۔ یارب العالمین

مسکولر ڈیسٹرافی

یہ ایک بہت بڑا انجینیئرنگ کا کام تھا۔ کمپنی کے منتظم اعلیٰ سے لیکر ایک عام کارکن تک اس کی کامیابی کے لئے دعا گو تھے

کام ہی ایسا تھا کہ اس کے سبب اس سے ملحق دوسرے کارخانے بھی بند تھے۔ ایک بہت بڑا تالاب تھا جس کی گہرائی شہر میں واقع پانچ منزلہ فلیٹ مثلاً حسن سکوئر، الاعظم پلازہ کے برابر تھی۔اس کی تہہ میں مرمت کا کام تھا بیرون ملک سے آئے ہوئے سول انجینئرنگ کے ماہرین بھی کام کا جائزہ لینے کے لئے موجود تھے۔اس مرمت کے لئے پورے تالاب کا پانی خالی کرنا ضروری تھا۔ یہ تالاب بھی کیا تھا مختلف اقسام کے پانیوں کا مجموعہ۔ کبھی سمندری پانی آگیا۔ کبھی تیل ملا پہنچ گیا۔ کبھی زنگ آلود پانی مل گیا۔ اور تو اور کبھی گرم پانی ہی شامل ہوگیا۔جلے لوہے کا برادہ ملا پانی تو آتا ہی رہتا تھا۔ کام زور و شور سے جاری تھا۔ پمپ متواتر چل رہے تھے۔کارکنان ایک دوسرے کو ہدایات دیتے ہوئے آوازیں دے رہے تھے۔کچھ صاحبان اوپر دیوار پر کھڑے معائنہ کر رہے تھے۔ وہ بالکل چھوٹے چھوٹے بونوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہم جو نیچے کھڑے تھے انہیں بونے لگ رہے تھے اور وہ ہمیں۔ واہ اللہ کی کیا

کرشمہ آرائی ھے-- اچانک چیف انجینئر نے مجھے اشارہ کرکے ایک عجیب مخلوق کی طرف توجہ دلائی- یہ غالباً مینڈک تھا-بڑے سائز کا- میرے ہاتھ کے پنجے کے برابر- لیکن اس کی ساخت عجیب سی تھی- اس کی دو انچ کی دم سلامت تھی-شاید آپ کو علم ھو کہ مینڈک جب پیدا ھوتا ھے یہ دم دار ھوتا ھے پھر آہستہ آہستہ اس کی دم جھڑ جاتی ہے اور وہ مینڈک بن جاتا ہے-- میں نے مینڈک سے پوچھا "مینڈک یہ تجھے کیا ہوا ؟کیا افتاد پڑی کہ یہ حال ہوگیا؟اس نے پیر اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا- مجھے ایک طرف ایک کونے میں لے گیا اور بولا "بھائی خاموش رہیں- میں نے اپنے برادری والوں سے بھی یہ بات چھپائی ہے- آج کل میڈیا والے ہم جیسوں کی تلاش میں رہتے ہیں -میڈیا میں شور مچ جائے گا- میں تمھیں داستان غم سناتا ہوں - لیکن اس وصیت کے ساتھ کہ یہ داستاں میرے مرنے کے بعد لوگوں کو سناؤگے
آج اس واقع کو تیں برس گزر گئے ہیں- کئی برساتیں آئیں اور گزر گئیں- کئی حکمران ائے اور چلے گئے- وہ مینڈک نما مچھلی یا مچھلی نما مینڈک بھی اس جہاں سے رخصت ہو گیا ہوگا- اس نے کہا تھا میاں جی یہ جین کا نظام بھی عجب ہے- ایک نسل سے دوسری نسل ، ماں باپ سے بچوں کو منتقل ھوتا رہتا ھے- لیکں خورک خراب ہو تو سب جین فیل ھو جاتے ہیں -اور خوراک اچھی بھی ھو تو تب بھی دوسرے اسباب کے سبب فیل ھو جاتے ہیں -وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے- سو میرے

ساتھ بھی یہی ہوا۔ صحیح قسم کے جین لیکر اس دنیا میں وارد ہوا تھا۔اس پانی کے تالاب میں آرام سے رہتا تھا۔نغمے گاتا تھا۔ لیکن تم آدم زادوں نے اس پانی کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس میں کیا نہیں شامل۔ سو میرے جسم کی ساخت ہی بدل گئی۔ صحیح خورک ملتی ۔ تو میرا یہ انجام نہ ہوتا

تب مجھے یاد آیا کہ ایک پودا بھی گھر سے باہر لگے باغیچے میں ایسی ہی شکایت کر رہا تھا۔ پودے نے کہا تھا کہ آپ نے مجھے اس چھوٹے سے گملے میں لگایا۔ کھاد کم دی۔ خوراک صحیح مہیا نہیں کی اور میری جین متاثر ہوئی۔ اب میرے پتے جو ستارے کی طرح نوکدار ھوتے تھے نہیں بن سکے۔مجھے صحیح خوراک دیں ۔وٹامن کا خیال رکھیں ۔ مٹی کی خاصیت صحیح کروائیں پھر مری چال دیکھ لیں۔ وہی ستارے کی طرح نوکدار۔ وہی چاند کی طرح چمکدار۔ آہ انسان خاکی نے میرے ساتھ کیا کیا ظلم روانہ رکھا

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ خوراک ہی جو مسکولر ڈیسٹرافی Muscular Dystrophy کے مرض کو جنم دیتی ہے۔ مسکولر ڈیسٹرافی بھی ایک عجیب بیماری ھے۔ اس میں بچوں کے جوڑوں میں اچانک مسئلے پیدا ھو جاتے ہیں اور عمر کے ساتھ پورے جسم کے جوڑوں تک پھیل جاتے ہیں۔بچہ بالکل معذور ھو جاتا ھے۔ یہ موروثی بیماری ہوتی ہے اور ماں سے منتقل ھوتی ھے۔ اور ماں سے بھی صرف بیٹے کو

بیٹی کو نہیں ۔ بہت کم ایسے کیس ھوتے ہیں جن میں یہ ماں سے بیٹی کو منتقل ہو ۔اس کا افسوس ناک پہلو یہ ھے کہ اس کا علاج اب تک دریافت نہیں ہو سکا۔ یہ چار ہزار میں سے ایک بچے کو ہوتا ھے اس لئے اس کے بارے میں معلومات اتنی عام نہیں ۔اس کی تشخیص کے لئے ایک ٹیسٹ "سی پی کے" برائے ہڈی کرواتے ہیں

اگر خوراک صحیح ہو تو وقت سے پہلے اس پر قابو پانے کے امکانات ہیں چاہے یہ کیسی موروثی بیماری نہ ہو۔ جب پاک سوزوکی کمپنی کے سابق ڈائرکٹر انتظامی امور میجر ریٹائرڈ صغیر احمد صاحب نے بھی مجھ سے اتفاق کیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ مینڈک، پودے اور ہم انسانوں کی آراء میں ھم آہنگی ھے۔

میجر صاحب کہہ رہے تھے جب اس کا علاج نہیں تو کیوں نہ خوراک کے ذریعے اس کو قابو میں لانے کی کوشش کی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ خوراک میں ایک چیز ہوتی ھے جسے کولیں کہتے ہیں۔ یہ پٹھوں سے سی پی کے کے اخراج کو کم کرنے میں معاون ثابت ھوتی ہے اور اس مرض میں کمی کا باعث بن سکتی ہے۔ کولیں گائے کی کلیجی میں سب سے زیادہ ھوتی ھے ۔مرغی کی کلیجی ،انڈے کی زردی اس کا بہت سا ذخیرہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح وٹامن ای بھی اس مرض کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتا ھے وٹامن ای کیلا، مکئی پیلی، مچھلی کا تیل، پالک ،انڈے کی زردی میں بہت مقدار میں ھوتی ہے۔ میجر صاحب اپنی ایک ویب سائٹ کے ذریعے اس پر روشنی ڈال

کر خوراک کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں

کراچی میں مرض کا شکار لوگوں کے لئے ایک انجمن بنی ہے۔ اس کے صدر عدنان سرور خود بھی اس کا شکار ہو چکے ہیں ۔اس کے علاوہ ان کی بہن اور اور ایک دوسرے بھائی بھی اس میں مبتلا ہیں ۔ وہ اپنی بساط کے مطابق اس کے بارے میں معلومات لوگوں کو مہیا کر رہے ہیں۔ فیس بک کے ذریعہ اس بارے میں اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہیں ۔ 26 مارچ کو اس بارے میں آگہی کا ایک سیشن آرٹس کونسل کراچی میں کیا گیا تھا۔ اس میں ماضی کے مشہور اداکار قاضی واجد نے شرکت کی ۔

یہ صحیح نصیحت تھی

عقیل عباس جعفری کا ایک شعر ہے

میرے دم سے یہ بزم ہے لیکن

میرا ہونا بھی کیا ضروری ہے

میرا ہونا بھی کیا ضروری ہے

یہ مصرعہ مجھے ماضی میں لے جاتا ہے

تیس چالیس سال پہلے میں ایک جونئر پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ ابھی جوائن کئے ایک سال ہی ہوا تھا۔پتہ چلا کہ ایک صاحب ریٹائرڈ ہو رہے ہیں۔ اس زمانے میں کسی کو ریٹائر ہوتا دیکھ کر بھی عجیب سا لگتا تھا "اچھا کوئی ریٹائرڈ بھی ہوتا ہے"

خیر ریٹائر ہونے والے صاحب کی پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ جیسا کہ ہوتا ہے اس قسم کی پارٹی سب افراد کی کنٹری بیوشن سے ہوتی ہے۔ سو مجھ سے بھی پیسے

مانگے گئے اور میں نے بخوشی پیسے پکڑادئے۔ ذہن میں یہی تھا کہ پارٹی میں نہیں جاؤں گا۔ ۔پیسے اس لئے دئے کہ کہیں اعتراض نہ اٹھے کہ پیسہ نہیں دینا چاہتا۔

شام کو میرے ڈپٹی انچارج پارٹی کے لئے لینے آگئے۔ میں نے کچھ بہانہ کر دیا ۔وہ سمجھ گئے کہ میں جانا ہی نہیں چاہتا۔

انہوں نے گاڑی غصے سے آگے بڑھائی اور کہا "منیر صاحب-- پیسہ دینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو الوداع کہنے کا انداز بھی ہوتا ہے-- کسی کو یہ بھی احساس دلانا ہوتا ہے کہ آپ سب سے پیارے تھے۔ آپ نے ہمارے لئے بہت کچھ کیا ہے"۔

وہ غصے سے چلے گئے۔گاڑی کی گرد اور دھنواں پیچھے رہ گیا۔ مجھے سوچنے کے لئے بہت کچھ دے گئے۔

آج ڈپٹی انچارج صاحب بھی ریٹائرڈ ہو گئے اور میں بھی ریٹائرڈ ہو گیا۔لیکن کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے تو انہیں میں کہتا ہوں کہ آپ کی نصیحت اپنے بچوں کو بھی کرتا ہوں۔

یہ صحیح نصیحت تھی۔

اس کے لئے اس کا دھرم --- میرے لئے میرا دھرم

الہ آباد--- بھارت کا ایک شہر اور ضلع جسے وزیر اعظموں کی سرزمین کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا-

پنڈت جواہر لال نہرو- اندرا گاندھی- لال بہادر شاستری- راجیو گاندھی- گلزاری لال نندہ اور کئی بھارت کے دیگر وزرائے اعظم سب اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے

الہ آباد جہاں سے بڑے بڑے ادیبوں نے جنم لیا--اکرم الہ آبادی کو کون نہیں جانتا وہ بھی اسی شہر کے باسی تھے- ابن صفی جن کے جاسوسی ناولوں اور ناول کے کرداروں عمران - فریدی - حمید نے دھوم مچا رکھی تھی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا

نئی نسل امیتابھ بچن کی شیدائی ہے- امیتابھ بچن نے بھی اس شہر میں جنم لیا

لیکن مستقبل میں اب یہ شہر "ایکو لال ساندل اور اکبر کیس" کے حوالے سے بھی یاد کیا جائے گا

"ایکو لال ساندل" کون ہے

لکھنو میں ایک چائے کا کیبن چلانے والا ایک غریب آدمی

اس کے حوالے سے کیوں یہ شہر یاد کیا جائے گا

سال 2002 کی بات ہے۔ ایک بچہ جس کی عمر ڈھائی تین برس کے لگ بھگ ہو گی لکھنو کے ایک باغ کے کونے میں لوگوں کو ملا۔ وہ شدید بخار سے تپ رہا تھا اور تقریباً نیم بے ہوشی کے عالم میں ہی تھا اور غالباً اسے نمونیہ بھی تھا۔ اس کی آنکھیں بھی زرد ہو رہی تھیں

کمزور سی پسلیاں

چھوٹا سا بچہ

نمونیہ کا شکار

آنکھیں زرد

محلے والوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ وہ چل بھی نہیں سکتا تھا اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی۔

اسے محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اس نے دیکھنے کے بعد کہا کہ اسکے جگر میں کچھ مسئلہ لگتا ہے۔اور صحت کی حالت کافی حد تک تشویشناک ہے۔

یہ آبادی زیادہ تر غریب افراد پر مشتمل تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب تک لوا حقین کا اتہ پتہ نہیں ملتا اسے کون رکھے۔سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔آخر یہ چائے کا کیبن چلانے والا ایکو لال ساندل آگے بڑھا اور اپنی کمزور آواز میں کہا میں اسے رکھوں گا اس کی آنکھوں کی چمک ۔آواز کی پختگی اور اس میں چھپا اعتماد یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ جذباتی انداز میں سوچنے والا نہیں ہے بلکہ اس نے تھوڑی دیر میں سب کچھ سوچ لیا ہے ارے ایکو بھیا تمہارا کھوکھا کونسا زیادہ چلتا ہے۔تم کب تک رکھو گے۔ اسے کسی یتیم خانے کے حوالے ہی کر دو

لیکن ایکو لال ساندل نے دوبارہ اصرار کیا۔ اس کی آواز مزید محکم اور مضبوط تھی

چلو خیر ہے رکھ لو ہم بھی دیکھتے رہیں گے۔ بھگوان کرپا کرے گا

اور بچہ کیبن والے ایکو لال ساندل کے حوالے ہوا

ایکو لال ساندل نے اس کی صحیح طریقے سے دیکھ بھال شروع کی۔۔۔ تنگدستی کے باوجود اسکی دوائیوں میں کسی قسم کا ناغہ نہیں کیا۔اور قوت بخش خوراک اپنی بساط کے مطابق دیتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ صحت مند ہونے لگا

اب تو بچہ صحت مند بھی ہو گیا ہے۔پھر اس سوال نے دوبارہ جنم لیا کہ کہ اب کیا کریں ایکو لال ساندل نے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی تاکہ وہ اپنے طور پر معلومات حاصل کر کے بچے کے والدین کا پتہ چلائیں

بچے سے پوچھا گیا تو اس نے اپنا نام اکبر بتایا اور اس سے زیادہ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ والد کا نام ابو اور والدہ کا نام بھی اسے علم نہیں تھا

ایکو لال ساندل

نے ہمت نہیں ہاری اور مسجد جا کر اور دیگر علاقے کی مساجد میں بھی جا کر اس کے لئے منادی کروائی۔لیکن کوئی بھی بچے کو لینے نہیں آیا

تھانے والوں نے بھی پورا تعاون کیا اور قرب و جوار کے کوتوالیوں سے معلوم کروایا
لیکن کہیں بھی کسی بچے کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کروائی گئی تھی
تھک ہار کر محلے والوں نے فیصلہ کیا کہ اسے کسی یتیم خانے میں داخل کردیا جائے --
- لیکن ایکو لال ساندل پھر اڑ گیا کہ میں اس کی پرورش کروں گا
محلے والوں نے سمجھایا کہ بھائی تم کیا سمجھتے ہو یہ آسان معاملہ ہے تمہارا ہندو دھرم اور
یہ مسلمان - یہ سنجوگ کیسے ممکن ہے - ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں
گے -
کشن داس نہ کہا یہ تمہیں مشکل لگتا ہو گا مجھے نہیں - وہ اپنا قران پڑھتا رہے نماز پڑھے -
اپنے دھرم کے مطابق کام کرتا رہے میں اپنے دھرم پر چلتا رہوں گا - اس کے لئے اس کا
دھرم میرے لئے میرا دھرم
اس کی ضد کے آگے لوگوں نے ہتھیار ڈال دئے

اب ایکو لال ساندل کا اصل امتحان شروع ہوا لیکن وہ بخوبی راستے میں آنے والی دشواریوں کو اپنی فراست سے دور کرتا رہا۔ اسکول میں داخلے کا مسئلہ آیا تو نام کا مسئلہ اٹھا ہیڈ ماسٹر نے کہا کیا نام لکھوں

-- ایکو لال ساندل نے کہا یہ اکبر بتاتا ہے وہی لکھ دو

اگے پیچھے بھی تے کچھ ہو گا

چلو لکھ دو اکبر ایکو لال ساندل

-- ارے بابا کیوں شہر میں دنگا کرانا چاہتے ہو

بالآخر اس کا نام اکبر ساندل رکھ دیا گیا باپ کے نام کی جگہ ایکو لال ساندل بطور نگہبان یا گارڈین لکھا گیا

ایکو لال ساندل نے جو وچن محلے والوں کے سامنے کیا اس پر حرف بہ حرف عمل کیا۔اسے مسجد بھی بھیجنے لگا کہ قران سے بھی آشنا ہو جائے۔ نماز کا پابند بنانے کی کوشش کی لیکس اس پر پورا عمل نہ ہو سکا البتہ جمعے کی نماز کے لئے اسے صحیح طریقے سے اشنان کروا کر ۔ مسجد ضرور بھیجتا رہا

کشن داس کے گھر جاؤ تو کئی بار عجب منظر دیکھنے کو ملتا۔۔ ایک طرف ایکو لال ساندل ایک کمرے میں مورتیاں رکھ کر پوجا پاٹ میں مصروف ہوتا تو

- تھوڑے فاصلے پر ہاتھ میں تسبیح لئے اللہ کے حضور میں سر جھکائے ملتا
معاملات سب صحیح جا رہے تھے - نہ کسی مسلمان کو شکوہ ہوا اور نہ ہی کسی ہندو کو رنجش

پانچ سال بیت گئے -- پھر ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی ٹی وی چینل والے وہاں سے گزرے اور چائے پینے کے لئے ایکو لال ساندل کے کھوکے پر ہی اپنی گاڑی روکی - ٹی وی والوں کی عادت ہے کہ جہاں کہیں رکتے ہیں اپنے ٹی وی پروگراموں کے لئے کچھ خوراک ڈھونڈتے رہتے ہیں سو اپنی عادت سے مجبور ہو کر یا اپنی پیشہ ورانہ ضرورت کے پیش نظر انہوں نے لوگوں سے عام انداز میں گپ شپ کی اور انہیں پتہ چلا کہ یہاں تو ایک
- نہایت حیرت انگیز داستان پرورش پا رہی ہے
انسانیت کی معراج کی انتہا - ہمدردی کا ایک سمندر -- بہبود انسانی کا ایک عظیم مینارہ ,
- وہاں موجود ہے
انہوں نے مزید ٹیم کو فوری طور پر بلایا -- ایک چھوٹی سی میٹنگ وہیں پر منعقد کی -
پروگرام فلمانے کا طریقہ کار طے کیا اور اسی وقت ایک ٹی وی پروگرام ریکارڈ ہو گیا اور
- دوسرے انتظامی مراحل سے گزرنے کے بعد ٹیلی کاسٹ ہو گیا

۔ کس نے دیکھا کس نے نہیں اس کا پتہ نہیں

جنھوں نے دیکھا انھوں نے کس انداز میں اس خبر کو لیا۔اس کا علم نہیں ۔ ہو سکتا ہے کچھ گھروں میں کھانے کے دستر خوان یا ٹیبل پر بات ہوئی ہو اور اس کے بعد کچھ تبصرہ ہوا ہو اور اس کے بعد خاموشی ہو گئی ہو

مذہبی جماعتوں نے اسے کس تناظر میں دیکھا اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں ۔اندازہ اس لئے نہیں کہ انھوں نے شاید اسے کسی تناظر میں نہیں دیکھا تھا ورنہ اگلے آنے والے دنوں میں ہنگامہ مچا دیتے کہ یہ مذہبی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔ یہ کوئی نئی سازش جنم ۔ لے رہی ہے۔ پکڑو پکڑو۔۔ بچ کر نہ جانے پائے

۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا

البتہ ایک گھر میں کہرام مچ گیا۔ بیوی کے شور مچانے کی آوازیں باہر تک نکل آئیں۔ یہ تھا اکبر کے اصلی ماں باپ کا گھر۔ لکھنو سے 200 کلومیٹر دور الہ

آباد میں اکبر کے اصل والدین محمد عباس اور شہناز بیگم نے یہ پروگرام دیکھ لیا اور اب اس گھر میں شور مچا ہوا تھا۔اس میں خوشی کی آوازیں بھی تھیں اور جلدی لکھنو پہنچنے کے مطالبے بھی۔۔ محمد عباس شراب کا عادی تھا۔ پانچ سال پہلے وہ اپنے بچے کو لیکر شراب کے ٹھیئے پر پہنچا اور شراب پی کر ایسا کھویا کہ کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ بچہ اکبر کہاں چلا گیا نشے میں دھت محمد عباس جب گھر کئی گھنٹے بعد پہنچا تو بیوی شہناز نے بیٹے کے بارے میں۔ پوچھا تو تب بھی وہ مان ہی نہیں رہا تھا کہ اس کا لخت جگر اس کے ہمراہ ہی گیا تھا اور اس کے نشے کے دوران کہیں کھو گیا ہے۔

اصل والدین محمد عباس اور شہناز بیگم ایکو لالساندل کے گھر پہنچے اور بات چیت شروع کی۔ لیکن اکبر انکو پہچانتا ہی نہیں تھا۔وہ ایکو لال ساندل سے چپک گیا۔وہ معصومانہ انداز میں رو رہا تھا اور چیخ چیخ کر بول رہا تھا کہ وہ محمد عباس اور والدہ شہناز کے ساتھ نہیں جائے گا۔ اس نے ایکو لال ساندل کی میلی سی بش شرٹ مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر ایکو لال ساندل کا دل بھی پسیج گیا۔ اس کے سامنے وہ سارے مناظر گھومنے لگے کیسے وہ اس بچے کو لیکر آیا تھا۔کیسے اس کا علاج کروایا ۔ وہ شاید دل پر پتھر رکھ لیتا اور اکبر کو اس کے اصل والدین کے حوالے کر

دیتا لیکن اکبر کی حالت دیکھ کر اس نے بھی اکبر انکے حوالے کرنے سے انکار کر دیا
محمد عباس اور اسکی بیگم شہناز نے عدالت میں مقدمہ کر دیا۔ انہوں نے عجیب عجیب الزامات لگائے -- وہ سارے احسانات بھول گئے جو ایکو لال ساندل نے ان کے بیٹے پر کئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایکو لال ساندل نے دراصل اکبر کو اغوا کیا اور اسکے بعد یہ سارا ڈرامہ رچایا ہے۔ انکا یہ بھی کہنا تھا کہ ایکو لال انکے بچے سے اپنے ہوٹل میں کام کرواتا ہے اور چائلڈ لیبر قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ شہناز بیگم نے میڈیا میں بیان دیا کہ ایکو لال ساندل نے بچے پر جادو کروا کر اس کا دماغ پھیر دیا ہے۔ انہوں نے اسے کچھ ہندو مسلم مسئلہ بنانے کی سعی بھی کی

ایکو لال سندر نے ان تمام مصائب کا مقابلہ کیا۔ لیکن محلے والوں نے بھی اس کا ساتھ دیا
۔

مسجد کے مولوی صاحب نے عدالت میں آکر سارا پس منظر بتایا اور یہ بھی کہا کہ اکبر کی تعلیم عین اسلامی خطوط پر ہو رہی ہے ۔

تھانے کے سربراہ نے شہادت دی کہ ایکو لال سندال تو ہمارے پیچھے کئی دنوں تک

لگا رہا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ لیکن اکبر کے حقیقی والدین نے کہیں ایف آئی آر ہی نہیں درج کرائی تھی کہ کچھ پتہ چلتا ۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے بیان دیا کہ اکبر پڑھائی میں عام بچوں کی مانند ہے ۔اسکول کا کام باقاعدگی سے کرکے آتا ہے اور اسکول فیس بھی باقاعدگی سے دیتا ہے۔اس کی یونی فارم پر ہر روزانہ استری ہوتی ہے۔ جوتے بھی اچھی طرح چمکے ہوتے ہیں۔ غیر ضروری چھٹی بھی نہیں کرتا

حقیقی ماں باپ نے اپنے حقیقی والدین کا ثبوت دینے کے لئے اپنا اور اکبر کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی کروایا اور ثابت ہوا کہ محمد عباس اور شہناز ہی حقیقی والدین ہیں۔

ایکو لال ساندل نے اپنے بیان میں کہا کہ اسنے ایک اچھے پتا (باپ) کا کردار ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔اسے اس کے دھرم کے مطابق اسلام کی تعلیم دلوائی اور اسکول میں داخل کروایا۔ کبھی بیمار ہوا تو اپنا پیٹ کاٹ کے اس کا علاج کروایا۔اس نے اکبر کے سکول سے حاصل کردہ مارکس شیٹ کی کاپیاں اور مختلف بیماری کے سرٹیفیکیٹ دکھائے اور یہ بھی کہا کہ اس نے اس بچے کی خاطر شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی کیا اور اب تک شادی نہیں کی کہ نئی ماتا جانے

کیا سلوک کرے جبکہ مذہب کی دیوار بھی درمیان میں حائل ہو۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی جب اس نے کہا کہ بھگوان نے اس پر محبتوں کے جو پھول نچھاور کئے ہیں وہ انہیں اس بچے پر نچھاور کر رہا ہے۔کیا وہ غلط کر رہا ہے اس نے آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ بچہ معصوم تھا۔ میرا من نہیں مانا کہ اس کی معصومیت کا فائدہ اٹھا کر اس کا دھرم تبدیل کر دوں۔ یہ پاپ ہے مہا پاپ --- میں نے جو کچھ کیا اس میں میرا بھگوان میرے ساتھ تھا۔

جنوری 2008 میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج شری جسٹس.برکت علی زیدی نے نے تمام گوہوں کے بیانات وغیرہ سننے کے بعد فیصلہ دیا کہ ہم ایک سیکولر ملک میں رہتے ہیں۔جب مختلف ذاتوں کے افراد شادیاں کر رہے ہیں-- مختلف مذاہب کے افراد بھی آپس میں شادیاں رچا رہے ہیں تو دو مختلف مذاہب کے افراد گارڈین اور بیٹے کے طور پر کیوں نہیں رہ سکتے جب کہ بچے کا مذہب بھی تبدیل نہیں کیا جا رہا۔اور اسے صحیح تعلیم بھی دلائی جارہی ہو۔ اس فیصلے پر کسی کو منہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

یہاں سے کیس ہارنے کے بعد حقیقی ماں باپ نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ اس اثناء میں اکبر کے حقیقی والد کا انتقال ہو گیا اور والدہ بیوہ ہو گئی ۔ والدہ شہناز نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایکو لال سندال کی مالی حالت

ایسی ہے کہ وہ بچے کی پرورش صحیح طریقے سے نہیں کر سکتا۔ جبکہ شہناز خود دو مکانوں کی مالکہ ہے اس کا زری کا کاروبار ہے۔ بیوہ ماں نے مزید کہا کہ اب وہ بیوہ ہو گئی ہے اس لئے اسے اپنے بچے کی ضرورت ہے۔

سپریم کورٹ نے اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا اور انہیں اپنے کاروبار کا ثبوت۔۔ بچوں کی اسکول فیس۔۔ اور آمدنی کا ایفیڈیوٹ لانے کو کہا۔ شہناز بیگم کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکی اور نہ ہی آمدنی کا ایفی ڈیوٹ جمع کرایا یہاں پر ایک اور واقع ہوا جس نے فیصلے کا رخ تعین کرنے میں کافی مدد کی۔ ایکو لال سندل کا ایک مسلمان دوست جو کہ دوبئ میں نوکری کر رہا تھا چھٹی پر بھارت آیا تو اسے تمام واقعہ کا پتہ چلا۔ اس نے کہا کہ ایکو لال سندل اس کا منہ بولا بھائی ہے۔ یہ بھی بچپن میں کہیں کھو گیا تھا تب میرے مسلمان والدین نے اسے گھر میں رکھ لیا تھا اور مذہب تبدیل کئے بغیر اس کی پرورش کی تھی۔

باآخر سپریم کورٹ نے بھی فیصلہ ایکو داس ساندل کے حق میں کیا اور کہا کہ شہناز کے دو بچے ہیں جن میں بیٹے کی عمر آٹھ سال اور بیٹی کی عمر چھ سال ہے

سپریم کورٹ نے اس امر پر نہایت ہی اچنبھے کا اظہار کیا کہ بچے کے ماں باپ نے اس۔
کی گمشدگی کی ایف آر درج نہیں کرائی۔۔ عدالت نے مزید کہا کہ ایک بیٹے کو اسکی
خواہش کے برعکس اس کے ماں باپ کے حوالے کر دینا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ بچے
کی رائے کو اہمیت دینی پڑے گی۔

عدالت نے مزید کہا کہ اگر کبھی مستقبل میں ایسا قانون بنانے کی کوشش کی بھی جائیگی تو
ایکولال ساندل اور اکبر کیس کی نظیر اسے روک دے گی۔

ایچ آر مینیجرز کے لئے ایک نصیحت

یہ کراچی کے مضافات میں واقع ایک کارخانے کا قصہ ہے
ایک ورکر کو پیٹ میں تکلیف ہوئی۔ رات کے تین بجے تھے۔ اسے کارخانے کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ وہاں نہ جانے کیا مسئلہ ہوا کہ شفٹ انچارج کو کارخانہ چھوڑ کر مداخلت کرنی پڑی۔ لیکن یہ مداخلت مہنگی پڑی۔ ڈسپنسر نے شفٹ انچارج کو گریبان سے پکڑ کر دھکے دئے۔

اگلے دن کوئی بھی ورکر شفٹ انچارج کی سائیڈ لینے نہیں آیا حالانکہ شفٹ انچارج نے انہی کے مفاد کے لئے ڈسپینسر سے پوچھ گوچھ کی تھی۔

شفٹ انچارج جو کہ میکانیکل انجینئر تھا بڑا مایوس ہوا۔ اس کا سارا یقین اور اعتماد خاک میں مل رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ایک ورکر کی غلط حرکت کے سبب اس میں ہمیشہ کے لئے اعتماد کی کمی واقع ہو جاتی اور ملک ایک اچھے انجینئر سے محروم ہو جاتا۔

یہ ایک سنگین مسئلہ تھا چنانچہ ایچ آر مینیجر نے اسے سنجیدگی سے لیا۔ لیکن اسے کہیں سے ایسا سرا نہیں مل رہا تھا کہ ملزم اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔

اپنی یونیورسٹی کے ایک وزٹنگ پروفیسر کو فون کیا اور اپنی مشکل سے آگاہ کیا "سر اسے ہر قیمت پر سزا دینا چاہتا ہوں کیوں کہ دوسری طرف یہ بھی شور اٹھے گا کہ انتظامیہ ڈھیلی ہے اور ویسے بھی ملزم کو سبق تو ملنا ہی چاہیے" ۔

پروفیسر صاحب کا پاکستان میں ایچ آر فیلڈ کا تیس سال کا تجربہ تھا اور اس وقت بھی کسی ملٹی نیشنل صنعتی ادارے میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے انتظامی معالات و افرادی امور دیکھ رہے تھے ۔ جب انہیں فون کیا تو اس وقت وہ شاید اچھے موڈ میں تھے۔ ٹیلی فون پر ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا "ہاہاہا ترکیب --- پی ایف --۔ استعمال کرو اور خود سگریٹ کے پف لگا کے بعد میں تماشہ دیکھو۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے" ۔

اس سے پہلے مینیجر صاحب مزید کچھ پوچھتے ۔ڈائرکٹر صاحب نے کہا" میاں اس کا مطلب یہ ہے اس فرد یا مجرم کی پرسنل فائل منگوا کر بغور جائزہ لو۔ باریک بینی سے مطالعہ کرو۔ دستخطوں کو اچھی طرح دیکھو۔۔ مختلف ڈیٹس جو سرٹیفیکیٹ میں ہیں انہی کا تجزیہ کرو تمہیں اس کے کاغذات میں یا اس کی درخواست میں یا

کسی سرٹیفیکیٹ میں یا جوائن کرنے بعد کسی معاملہ میں یا کسی اور طرف سے روشنی کی ایسی کرن ضرور ملے گی جس کی بنیاد پر اس ملزم کے خلاف کاروائی کر سکتے ہو چاہے اس خامی کا اس موجودہ معاملے سے بالکل ہی تعلق نہ ہو۔ مقصد ہے اسے سزا دلوانا یا اسکے خلاف کاروائی کرنا ہے۔ تاکہ دیگر لوگوں کو میسیج جائے کہ انتظامیہ کو ڈھیل ڈھالی نہیں ہے۔

اس ڈسپینسر کی پرسنل فائل منگوائی گئی۔ اس کا بغور مطالعہ کیا گیا۔ ایک جگہ ایک پوائنٹ مل ہی گیا۔ وہ تھا ڈسپینسر کا میڈیکل ٹرینگ کا سرٹیفیکیٹ۔ یہ جعلی لگ رہا تھا۔ کسی نے اوور رائٹنگ کی تھی۔

مینیجر نے اپنے پرسنل سیکرٹری کو ایک ہزار روپے دئے کہ جاؤ اور ڈاؤ میڈیکل کالج جا کر سرٹیفکٹ یا سند کی تصدیق کرا کے لاو۔ ایک ہزار اس لئے دئے کہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں کوئی اتنا مخلص نہیں کہ فوراً سند کی تصدیق کرے۔۔

خیر ڈاؤ میڈیکل کالج والوں نے پرانا سارا ریکارڈ نکالا اور پتہ چلا کہ یہ سند کسی اور کے نام اشو ہوئی تھی اور اس ڈسپینسر نے اس کو اوور رائٹ کرکے اپنا نام لکھ لیا تھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسی سرٹیفکٹ کی بنیاد پر سعودی عرب بھی نوکری کر آیا تھا۔

انتظامیہ نے اگلے ہی دن اسے نوکری سے باہر کیا۔ اس طرح ایک ڈسپلن کا کیس جس میں مجرم کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تھی نہیں مل رہی تھی اسے ہشیار انتظامیہ نے کسی اور طریقے (یعنی پرسنل فائل) کے ذریعہ حل کیا ۔

انتظامیہ نے مزید کہا کہ شکر کرو تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا ورنہ اس پر دھوکہ دہی لوگوں کی جانوئ سے کھیلنے اور جعلی سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے الزامات پاکستان کے قوانین کے مطابق لگ سکتے تھے ۔

اس سلسلے میں ایک ایچ آر مینیجر سے بات ہوئی تو انہوں نے ایک سینئر بنکر محمد سعید جاوید کی ایک کتاب "اچھی گزر گئی" جو کہ پچھلے سال ہی لاہور کے ایک ادارے "پرل پبلشر" سے چھپی ہے کا حوالہ دیا کہ جناب سعید صاحب کو بنک میں ایک ہیڈ کیشیئر سے واسطہ پڑا جو کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور نہ دیگر عملے کو کام کرنے دیتا تھا۔

پورے بنک کا ماحول خراب کیا ہوا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا جن لوگوں کے اکاونٹ کھلے ہوئے تھے اس سے بھی ترش روئی سے پیش آتا تھا۔ بنک ۔ مینیجر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تو انہیں بھی الٹی سیدھی سنا دیا کرتا تھا۔ ایک آڈٹ ٹیم والے آئے تو انسے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا بلکہ کام میں روڑے ہی اٹکائے ۔

غلط

معلومات پہنچانے کی کوشش کی۔ آخر چیف آڈیٹر نے تنگ آکر یہی پرسنل فائل کا طریقہ استعمال کیا۔ پرسنل فائل منگوائی اور ایک کاغذ ایسا ملا جس کی بنیاد پر وہ شام تک نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔

بکرا ہاتھ ملا رہا تھا

یہ کراچی کے مضافات کی بات ہے۔ میں موٹر سائیکل پر کہیں جا رہا تھا۔ اچانک اس میں سے آواز آنے لگی۔ نزدیک ہی ایک موٹر میکانک کی دکان نظر آئی۔ میں وہاں چلا گیا۔ موٹر سائیکل میکانیک کے حوالے کرکے میں ارد گرد نگاہ ڈالی تو ایک بکرا نظر آیا جو غالباً میکانیک نے پالا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بچوں سے ہاتھ ملاتا تھا یعنی اپنے سامنے والے پیر کو اٹھاتا اور بچوں کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ بچوں کو ایک کھیل تماشہ ملا ہوا تھا۔

پھر بکرا ان کے اس کھیل تماشے سے بیزار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بےزاری کا اظہار ایسے کرنا شروع کیا کہ جو بچہ بھی ہاتھ ملانے آتا اسے سینگ مارنے کی علامتی دھمکی دیتا۔ لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان کو سینگ نہیں مارنا چاہتا صرف بیزاری ظاہر کرنا چاہ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا بکرے کو سینگ کے عین نیچے سر میں کچھ کھجلی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اسے ایک کھمبے کے سپورٹنگ لوہے کی رسی سے کھجانا چاہ رہا ہے۔ لیکن اسے تشفی نہیں ہو رہی۔

میں تو فارغ تھا ہی۔ ایک درخت کی ٹہنی ساتھ ہی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ ٹہنی
۔ اٹھائی اور بکرے کے سینگ کے عین نیچے والے حصے میں کھجا دیا۔ اس کو سکون ملا
اسی لمحے میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ آگے آیا اپنا پیر اٹھایا اور مجھ سے ہاتھ ملانے کے
لئے آگے بڑھا دیا۔۔ وہ میرا شکریہ ادا کر رہا تھا
حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ بچوں سے ہاتھ ملانے کے معاملہ پر ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا
مولانا مودودی نے تفہیم القران میں ایک جگہ اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کرتی ہوئی ایک
آیت کی تشریح کرتے ہوئے کچھ ایسے تحریر کیا ہے کہ کہ کیا بچوں کی معصوم باتیں،
قرب و جوار کے چرند پرند کی دل لبھانے والی حرکتیں تمہارے دل کو مسرت نہیں دیتی
ہیں

ڈاکٹر فضل الرحمن خان

قدرت نے انجینئرنگ کے علم میں بھی طرح طرح کے کھیل چھپا رکھے ہیں۔ دیکھتے جاؤ اور قدرت کی کرشمہ آرائیوں پر انگشت بدندان ہوتے رہو۔

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایک انچ موٹائی کا سریہ لیکر اسے موڑنا چاہیں تو آسانی سے مڑ جائے گا اور اسی ایک انچ کے سریے کو درمیان سے مناسب حد میں کھوکلا کر دیں تو وزن بھی ہلکا ہو جائیگا اور آسانی سے نہیں مڑے گا۔

ریل کی پٹری کو کو لے لیں۔ سامنے سے دیکھیں تو چھ انچ لمبائی اور تقریبا اتنی ہی موٹائی (اونچائی) ہوتی ہے لیکن اگر اسے انگریزی حرف آئی I کی شکل دے دیں تو طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے حالانکہ وزن کم ہو رہا ہے اسی لئے ریل کی پٹری آئی شکل کی ہوتی ہے اور مستطیل یا مربع شکل کی نہیں۔

لوہے کی شیٹ پر تو قدرت کی کرم فرمائیاں تو دیکھیں تو جادو کا کھیل لگے۔ کسی گھر میں لوہے کی چادر یا شیٹ سے بنی ہوئی چھت ہو اور بلی درخت سے اس پر چھلانگ لگا دے تو دل دہل جاتا ہے اور بلی کو صلواتیں سنائی جاتی ہیں -----اری

کیوں چھت کا بیڑا غرق کر رہی ہے---- کچھ دن تو سیدھی حالت میں رہنے دے - لیکن اسی لوہے کی سیدھی شیٹ کو نالی دار بنا لیا جاتا ہے تو بلی کو دعوت دیتے ہیں آ جا-- آ جا-- چھلانگ مار لے کچھ نہیں ہوتا- جا بلکہ اپنے ساتھ دوسری بلی کو بھی چھلانگ لگانے بلا لے -

قدرت نے انجینئرنگ کے اندر جو اسرار پوشیدہ رکھے ہیں--- ڈاکٹر فضل الرحمان --- ان کے کرشموں سے واقف تھے اور یہی انہوں نے اپنی تعمیر کردہ عمارتوں میں انتہائی مہارت سے استعمال کر کے دنیا کو دنگ کر دیا- -انہوں نے جان ھینکاک بلڈنگ کا ڈیزائن کرتے وقت کہا کہ عام اسٹرکچر جو اس سے پہلے ایمپائر بلڈنگ میں استعمال کیا ہے نہ بناؤ بلکہ اس کی بجائے عمودی ٹیوب کی مانند ڈھانچہ یا اسٹرکچر Vertical Tube like structure بناؤ جو زلزلہ کی ہمہ اقسام سہہ لے گا بلکہ بالائی فضا میں چلنے والے ہوا کے جھکڑ کے سامنے بھی سینہ سپر ہو کر کھڑا رہے گا- اور اس کا اضافی فائدہ یہ حاصل ہو گا کہ لوہا کم خرچ ہو گا- اگر اس سے قبل ایمپائر بلڈنگ میں 240 ٹن لوہا لگا ہے تو یہاں 145 ٹن لوہا لگے گا -

مضبوطی زیادہ اور خرچ کم-- یہ ہیں قدرت کے کمالات جو انجینئرنگ کے علوم میں

- پوشیدہ ہیں

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

اللہ کی کن کرشمہ آرائیوں کو تم جھٹلاوگے

بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) کے ایک انجینئر--- جنھوں نے اپنے زمانے کی امریکہ

میں دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ تعمیر کی 1950 میں ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ کی

ڈگری حاصل کی جان ھینکاک بلڈنگ کے علاوہ انھوں نے شکاگو میں سیرس ٹاورز بھی

ڈیزائن کیا تھا۔

شکاگو امریکہ کی ایک سڑک ان کے نام سے موسوم کی گئی۔ سعودی عرب میں شاہ

عبدالعزیز ایئر پورٹ جدہ کے حج ٹرمنل کی ڈیزائننگ پر آغا خان ایوارڈ فور آرکیٹیکچر

-عطا کیا گیا۔ حکومت بنگلہ دیش نے ان کی تصویر سے مزین ڈاک ٹکٹ جاری کیا

جناب جمیل الدین عالی نے جنگ کراچی میں تیس سال پہلے اپنے کالم مین ان کے انتقال

کے موقع پر ان کا تزکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اب وہ

بنگلہ دیشی ہیں لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کی جامعہ سے ہی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی اور یہ امر ہمارے لئے باعث اعزاز ہونا چاہئے۔

انہوں نے لکھا کہ امریکہ میں ان کی وفات پر خبریں شائع ہوئیں اور پاکستان میں کہیں صرف دو سطر کی خبر چھاپی گئی۔ جمیل الدین عالی نے انسائیکلوپیڈیا برٹنیکا کا حوالہ دیتے۔ انکی تعمیر شدہ عمارات کا تذکرہ بھی کیا تھا

آپ کچھ عرصہ کے ڈی اے (کراچی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی) میں بھی کام کر چکے ہیں لیکن چونکہ پاکستان میں ڈیزائن کا اتنا کام نہیں ہے جبکہ فضل الرحمان صاحب ڈیزائن سے رغبت رکھتے تھے اس لئے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر امریکہ کا رخت سفر اختیار کیا اور عالمی شہرت پائی۔

!جنرل موسی آپ کیا غم لیکر سینے میں گئے

جنرل موسی تاریخ پیدائش 1908 بمقام کوئٹہ
اپنی خود نوشت جوان سے جنرل تک (انگریزی)
صفحہ 129 پر تحریر کرتے ہیں
مجھے 1958 میں تمام مسلح افواج کا سربراہ مقرر کیا گیا۔
میرے سسر اور ان کے بیٹے افغانستان کے رہاشی تھے۔
پاکستان کے افغانستان سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے
۔ میرے مسلح اافواج کے سربراہ بننے کے تقریباً دو سال بعد 1961 میں افغانستان
حکومت نے میرے سسر اور سالے محمد علی کو گرفتار کرکے غزنی کی جیل بھیج دیا۔

یہ کسی جرم میں ملوث نہیں تھے لیکن صرف میرے رشتے دار ہونے کے سب انہیں
۔گرفتار کیاگیا اور جیل میں تشدد کانشانہ بنایاگیا میرے سسر کا جیل میں انتقال ہو گیا
میرے سالے کو غزنی جیل سے نکال کر کابل کے مشہور دیہہ موزنگ جیل میں بھیج دیا
جرم یہ تھا کہ تم پاکستان کے مسلح افواج کے سربراہ کے سالے ہو۔ آخر حکومت
افغانستان نے محمد علی کو رہا کر دیا۔ محمد علی افغانستان سے نہایت کسم پر ی کی حالت
میں نکلا اور اپنے خاندان کے ہمراہ سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے چھپتے چھپاتے پاکستان
۔ آگیا

جنرل موسی کہتے ہیں کہ میرے داماد ایر مارشل چنگیزی کی تعیناتی جب کابل میں
۔ پاکستانی سفارت خانے ہوئی تو میری بیوی اور میرا بیٹا 1975 میں کابل گئے
وہ وہاں سے غزنی بھی گئے۔انہیں امید تھی کہ انکے والد اور نانا کی قبر کا پتہ چل جائے گا
لیکن ناکامی ہوئی ۔

جنرل موسی لکھتے ہیں آج تک میری بیوی کو پتہ نہیں کہ اس کے والد (یعنی

۔میرے سسر) کہاں دفن ہیں

پھول کیوں کھلے - پرندے کیوں خوش ہوئے

جنرل موسیٰ

پیدائش بمقام کوئٹہ

اپنی خود نوشت جوان سے جنرل تک (انگریزی) میں صفحہ 134 پر تحریر کرتے ہیں کہ مجھے 1958 میں پاکستان کی تمام مسلح افواج کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ مجھے کسی کام کے سبب کوئٹہ جانا پڑا۔ سربراہ بننے کے بعد یہ میرا پہلا دورہ تھا۔ میں کوئٹہ بذریعہ ریل گاڑی گیا۔ کوئٹہ کے ریلوے اسٹیشن پر فوج کے سینئر افسران، ڈپٹی کمشنر، دیگر افسران بالا مجھے لینے آئے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے عام آدمی بھی اپنے شوق میں چلے آئے تھے۔

اچانک میری نظر اپنے والد پر پڑی جو ایک کونے میں تنہا کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے ان کے آنے کی امید نہیں تھی۔ اتنی دور سے میں ان کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ایک بیٹے کی حیثیت سے میں تصور میں لا سکتا تھا اور اس باپ کی دلی کیفیت کا اندازہ بھی لگا سکتا تھا۔ میں نے اپنے اے ڈی سی سے بات کی کہ والد کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے وہ ایسا کریں کہ جنرل افسرز اور ڈپٹی کمشنر سے کہیں کہ میں پہلے اپنے والد کے پاس جاوں گا اور اس کے

بعد استقبالیہ تقریب کی کارروائی میں شرکت کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور ٹرین سے اترنے کے بعد میں سیدھا اپنے والد کی طرف گیا--ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے بعد انکے پیروں کو چھوااور ان سے نہایت حلیم لہجے میں کہا کہ وہ گھر چلے جائیں۔

بھرے بھرے درختوں کے اوپر نیلگوں فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندے ایک دم مسرت سے چہچہانے لگے۔ کہیں پھول کھلے تھے۔فضاء جو پہلے ہی خوشگوار تھی اب اس میں پھولوں کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی

جنرل موسی کہتے ہیں وہاں پر ہر ایک نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تالیاں بجائیں اور عام افراد جو آئے تھے انہوں نے نعرے بھی لگائے۔ بعد میں بہت سے اخباروں نے اس واقعہ کو نمایاں طور پر چھاپا اور کچھ نے تصاویر بھی چھاپیں۔جنرل موسی کہتے ہیں کہ میری اپنی رائے ہے کہ اس کا اتنا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر فرد اپنے والدین کا اتنا ہی احترام وادب کرتا ہے۔میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہاں البتہ اتنا ہے کہ جب میں نے یونیفارم پہنی ہوئی تھی اور سارے تمغے لگے ہوئے تھے اس وقت مذہبی اور ثقافتی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے والد کے پاس گیا

جنرل موسی کتاب میں کہتے ہیں نواب کالا باغ امیر محمد خان اس واقعے سے شاید بہت متاثر ہوئے تھے کیوں کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اور اپنے قریبی حلقوں میں بھی بات کی تھی

یہ بات بھی اپنی جگہ قابل ذکر ہے کہ جنرل موسی مرحوم نے اپنے والد کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی علالت کے دوران انکا اپنی آخری حدتک خیال رکھا اور ان کی وفات کے سبب اپنا دورہ روس کچھ موخر کردیا۔ روس کے رہنما باپ کے لئے بیٹے جنرل موسی کی محبت والفت اور بیٹے کے لئے باپ کی شفقت سے پوری طرح واقف تھے۔اسی لئے والد کے انتقال کے موقع پر روس کے وزیر اعظم الیکسی کوسیجن نے اپنی ذاتی حیثیت سے تعزیتی خط لکھ کر افسوس کا اظہار کیا

دوآپ بیتیاں

پاکستان نیشنل گارڈ کون ہیں
کوئی نہیں جانتا
مجھے بھی کچھ پتہ نہیں تھا

اتنا یاد ہے کہ سال 1960---1961 کی بات ہے ہم کوئٹہ میں رہتے تھے۔ غالباً یوم پاکستان کے سبب تعطیل تھی۔ گھر کے باہر راحت سینیما کے سامنے کے سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اس نے عجب کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جوتے اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہے تھے۔ اور لمبی سی مونچھیں تھیں۔ کسی نے کہا یہ نیشنل گارڈ ہے۔

اسے دیکھنے کے لئے سر اوپر تک اونچا کرنا پڑا تھا۔

بہت عرصے کے بعد--- تقریباً بیس پچیس سال بعد پتہ چلا کہ ایک اور فوج بھی ہوتی ہے جسے جانباز فورس کہتے ہیں۔ یہ جنگ میں فوج کی مدد کرتی ہے۔

فوج کی مدد کے جذبے کے تحت میں اس میں شامل ہوا۔ انکشاف ہوا کہ یہاں جذبہ نامی کوئی شے نہیں ہے بلکہ سرکاری ادارے اپنے ناکارہ افراد حکومت کے زور

دینے پر یہاں بھیج دیا کرتے ہیں- جب تربیت کے لئے پہنچا وہ میرے جذبے کا مذاق اڑاتے لگے اور مجھے عجب نظروں سے دیکھنے لگے - اس تربیت کے تحت میں نے طیارہ شکن توپ - مشین گن اور رائفل چلانا سیکھی -

رائفل چلانے کی مشق کے لئے پولیس تربیتی مرکز رزاق آباد لے جایا جاتا تھا- وہی پولیس تربیتی مرکز جس کی بس کو ابھی ایک ہفتہ قبل (13 فروری 2014) دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا اور 13 افراد شہید ہوئے -

کہنے کو میں نے ایک سطر میں لکھ دیا کہ رائفل چلانے کی تربیت حاصل کی لیکن اس دوران جن مراحل سے گزارا گیا وہ ہم جیسے غیر فوجیوں کے لئے نہایت ہی دشوار تھے- رائفل کو لیکر اس طرح رینگنا کہ اس کی نال زمین سے اونچی رہے اور اس دوران جسم / کمر وغیرہ بھی ایک خاص بلندی سے زیادہ نہ اوپر ہو اور پورا بوجھ کہنیوں اور پیر کے نچلے حصے پر ہو اور اس طریقے سے رینگتے ہوئے مخصوص مقام پر پہنچ کر دشمن کا نشانہ لیکر گولی چلانا اور فائر کے دوران رائفل اس طریقے سے پکڑنا کہ رد عمل کے طور پر بندوق پیچھے ہو تو جسم کو کوئی گزند نہ پہنچے -

اسی طرح طیارہ شکن توپ چلانے سے پہلے توپ کے مختلف حصوں کو جوڑ کر توپ کو

فائرنگ کی حالت میں لایا جاتا تھا۔ یہ مختلف حصے اتنے بھاری تھے کہ اٹھانا آسان نہیں تھا اور لمبے بھی اچھے خاصے ہوتے تھے -- اس کے لئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ہتھیلیوں سے اٹھانے کا انتظام کیا جاتا پھر اس پارٹ کو دونوں ہتھیلیوں کے اوپر اٹھا بقیہ حصہ دونوں پنڈلیوں کے درمیان رکھ کر کر ایک مقام سے توپ تک لاتے۔ طیارہ شکن توپ کا عملی مظاہرہ کرنے پاکستان ائر فورس کے تربیتی مرکز کورنگی کی کھاڑی لے جایا گیا۔

اتنا کچھ دیکھنے کے بعد تو میں بڑا مطمئیں تھا کہ صحیح تربیت دی جاتی ہے لیکن کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ بڑا شہر تھا اور اس کے علاوہ آپ کے ادارے نے بہت تعاون کیا تھا جس کے سبب تربیت کے مسائل پیدا نہیں ہوئے لیکن چھوٹے شہروں میں تربیت کا معیار اتنا اونچا نہیں۔ میرا دل نہیں مانا۔

لیکن پاکستان فوج کے سابق کمانڈر ان چیف جناب محمد موسی کی کتاب "جوان سے جنرل تک" (انگریزی) پڑھی تو حیرانی کے سمندر میں کھو گیا۔ اندازہ ہوا کہ لوگ صحیح ہی کہتے تھے۔

جنرل موسی اپنی کتاب جوان سے جنرل تک (انگریزی) میں تحریر کرتے ہیں کہ

پاکستان نیشنل گارڈ اس لئے تشکیل دی گئی تھی کہ جنگ کی صورت میں پاکستان کے پاس ایسے افراد (مرد و خواتین) دستیاب ہوں جو پاکستان کی سیکنڈ لائن کی دفاعی ضرورتیں پورا کر سکیں جنرل موسی لکھتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد گیارہ ماہ بعد (جولائی 1948) ان کی تبدیلی بطور ڈائرکٹر نیشنل گارڈ کے کر دی گئی۔ (صفحہ 89 سے 93 تک) لیکن جنرل موسی نے کچھ نا رضامندی اور بے رغبتی کا اظہار کیا۔اس وقت تک فوج کے سربراہ اور دوسری کلیدی پوسٹوں پر انگریز ہی تھے۔ جنرل گریسی کو اس کی وضاحت کرتے ہوئے جنرل موسی نے دلیل دی کہ نیشنل گارڈ میں خواتین بھی شامل ہیں جب کہ میرے قبیلے کی روایات کے مطابق میرے قبیلے کی خواتیں اس میں شریک نہیں ہوں گی جب میں اپنی خواتیں کو زور نہیں دے سکتا تو دوسرے خاندانوں کی خواتیں کو کیسے اصرار کر سکتا ہوں کہ اس میں شریک ہوں۔ لیکن جنرل گریسی نے ان سے کچھ متفق اور کچھ نا متفق ہوتے ہوئے انہیں پاکستان نیشنل گارڈ کے معاملات دیکھنے کو کہا کیوں کہ وہ فوج کے اس حصے سے مطمئیں نہیں تھے۔ - اور بالآخر جنرل موسی نے یہ معاملات دیکھنا شروع کئے۔

پاکستان بنے صرف بارہ ماہ ہوئے تھے۔ جیسے جیسے وہ اس تنظیم کے اندرونی معاملات میں گہرائی میں گئے وہ حیرت زدہ رہ گئے ایک نوخیز مملکت جسے بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ جو اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہیں ہوئی

تھی اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے ۔

کاغذات سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت تک پاکستان نیشنل گارڈ کی 56 بٹالیں بن چکی تھیں اور پاکستان نیشنل گارڈ کی خواتین کی کمپنی بھی موجود تھی ۔ یعنی چھ ڈویژن فوج بطور سیکنڈ دفاعی لائن تیار تھی ۔ دوسرے الفاظ مین ہماری سیکنڈ دفاعی لائن بہت قوی تھی لیکن یہ سب کاغذات کے مطابق تھا اندر معاملات نہائت ہی کھوکلے تھے نیشنل گارڈ کے یہ دستے کاغذوں میں تو موجود تھے لیکن عملاً ان کا کوئی وجود نہیں تھا ۔

ہر دستے کا ایک باقاعدہ آفیسر ہوتا تھا ۔ دیہاتوں میں نیشنل گارڈ کے رضاکار زیادہ تر کسان ہوتے تھے ۔ ان کے پاس پہنے کے لئے جوتے بھی نہیں تھے ۔انہیں اپنے گاوں سے چھ سات میل دور تربیت کے لئے ہفتے میں دو مرتبہ بلایا جاتا تھا ۔ اور انہیں کسی قسم کا معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا ۔ چنانچہ وہ آنے سے کتراتے تھے جبکہ کھیتوں میں کام کرنا ان کی اپنی معاشی ضروریات کے لئے اشد ضروری تھا ۔ اس لئے وہ نیشنل گارڈ کو ٹالنے کی کوشش کرتے تھے جنرل موسی کہتے ہیں کہ یہ بات اور توقع بھی غیر مناسب لگتی تھی کہ نیشنل گارڈ کے رضاکار ہفتے میں دو دن اپنے روزگار کو چھوڑ کر اس کام کے لئے وقف کر دیں ۔ گرمیوں کے موسم میں بالخصوص صرف چند ہی افراد اسکی ٹرینگ میں حصہ لیتے تھے

کیونکہ سخت تپش میں۔اپنے خود کے کپڑے سلا کر اور خود کے جوتے پہن کر میلوں میل
۔ چل کر ٹرینگ کی جگہ پر پہنچنا جس کا انہیں معاوضہ بھی نہ ملتا ہو انہیں کیوں پسند ہوتا
البتہ ان کے مقامی افسر یونی فارم کو بخوشی پہنا کرتے مقامی افسران اس کام سے مطمئین
اور خوش تھے کیوں کہ اپنے علاقوں میں ان کے حکام بالا سے تعلقات ہو جاتے تھے جس
کے سبب انہیں اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنا سہل ہو جاتا تھا۔ان افسران کو تربیت
۔ دینے یا صحیح طریقے سے بھرتی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی
جب بھی کوئی معائنہ ٹیم ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے پہنچتی تو نیشنل گارڈ کے یہ مقامی
۔ افسران پیسے دے دلا کر۔۔ یہاں وہاں سے افراد کو پکڑ کر کھڑا کر دیتے تھے
وہ زیادہ تر اپنا وقت ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں (ضلع کے صدر مقام) میں ڈپٹی کمشنر اور
پولیس کے قریب گزارتے تھے۔کوئی اعلی افسر آتا تو ایک دعوت کا اہتمام کرتے اور
سول افسران کو بلا کر مزید ذاتی مفادات حاصل کرتے ہر کمانڈنگ افسر اور یہاں تک کہ
کمپنی کمانڈر بھی شاذ و نادر ہی ان دستوں

اور بٹالین کا معائنہ کرتے تھے یونٹ کا ایک باقاعدہ فوجی افسر (ریگولر آرمی افسر) بطور ایڈجوٹنٹ ہوتا تھا۔ میں نے انہیں انتباہ کیا کہ حالات کی صحیح تصویر بتائیں اور انہیں مخفی رکھنے کی سعی نہ کریں۔

انہوں نے بھی تسلیم کیا کہ نیشنل گارڈ کے حالات صحیح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

انسان نے جو یکھا وہ رائیگاں نہیں جاتا

انسان نے جو یکھا وہ رائیگاں نہیں جاتا
بھارتی فلم گاندھی کے منتخب اداکار کی غلط خود کشی
آ نا دیوا انگاڈی--- بھارت کے مشہور شہر بنگلور سے تعلق رکھتے تھے۔ پنڈت جواہر لال
نہرو وہاں تعلیم کے لئے گئے تو انکی آ نا دیوا انگاڈی سے کافی واقفیت اور دوستی ہو گئی۔
آ نا دیوا انگاڈی کے بیٹے ڈیرین انگاڈی نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جہاں وہ بچپن
سے ہی پنڈت جواہر لال نہرو کے تذکرے سنتے تھے۔ نہرو کی عادتوں کے بارے میں
والدین کے تبصرے کانوں میں آتے رہتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہرو کی نقل کافی
صیح کر لیتے تھے۔
ڈیرین انگاڈی نے بعد میں فلم لائن اختیار کی اور اداکار بن گئے
شہرہ آفاق فلم "گاندھی" بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس فلم کے لئے مختلف
اداکاروں کی تلاش ہوئی تو جواہر لال نہرو کا کردار ادا کرنے کے لئے

فلم ساز وہدیات کار کی نگاہ انتخاب ڈیرین انگاڈی پر پڑی اور انہیں یہ کردار ادا کرنے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ چھ ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں فلم ساز اور ہدایت کار انکی کارکردگی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے رہے۔ ان کے متبادل اداکار کی صلاحیتوں کو بھی پرکھا گیا۔ یوروپین فلمساز فلم میں کسی قسم کا سکم اور جھول نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار ہدایت کار و فلم ساز اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈیرین انگاڈی نہرو کا کردار ادا کرنے کے لئے موزوں نہیں اور یوں انکی جگہ کسی دوسرے اداکار کو نہرو کا کردار ادا کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ حالانکہ اس دوران ڈیرین انگاڈی نے اپنے اداکاری کا معیار بلند کرنے کے لئے مزید محنت کی تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ جتنا وہ نہرو کی مختلف عادتوں کا شعور رکھتے ہیں کوئی اور نہیں رکھتا۔ اس بات سے وہ بہت مایوس ہوئے۔ مختلف موقعوں پر انہیں خلاء میں گھورتے ہوئے پایا گیا اور کسی خیالی ہستی سے بات چیت کرتے ہوئے پایا گیا۔ کبھی کبھار وہ نہرو کے انداز میں تقریر کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ۔اسی مایوسی کے عالم میں انہوں نے دسمبر ۱۹۸۱ میں خودکشی کر لی۔۔

بھارت کے مشہور مذہبی اسکالر جناب وحیدالدین صاحب اپنی کتاب "رازِ حیات" میں اس خودکشی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈیرین انگاڈی نے اپنے اندر محنت سے جو صلاحیت پیدا کر لی تھی انہیں اسے نہیں بھولنا چاہئے تھا۔ وہ ایک

قیمتی خزانہ تھا جو ان کے پاس تھا۔ - یہ صحیح ہے کہ فوری طور پر اسے استعمال کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس کی حیثیت ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے تھا کہ محنت اکارت گئی۔ اس محنت سے پیدا شدہ لیاقت بدستور موجود تھی۔ جلد یا بدیر انہیں کوئی دوسرا موقع ملتا جہاں اسے بہتر انداز میں استعمال کرکے پوری قیمت وصول کر سکتے تھے

۔

میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے بھوربن گیا۔ وہاں میں نے شرکاء سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ تب ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے ہان ہاں ایسا میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ میں میزائیل سازی کے ادارے سپارکو میں کام کرتا تھا۔ اسے چھوڑ کر ڈیزل انجن بنانے والے ایک کارخانے میں نوکری کر لی کیوں کہ وہاں مشاہرہ زیادہ تھا۔ ۔
ابھی یہان نوکری کر ہی رہا تھا کہ اسٹیل مل کا شہرہ سنا اور سب چھوڑ چھاڑ کر اسٹیل مل میں میکانیکل انجینیئر کی حیثیت سے شرکت کر لی ۔
ایک روز سینئر انجینیئر صاحبان نے دوبارہ انٹرویو لیا اور جب انہیں پتہ چلا کہ میں راکٹ سازی کرتا تھا اور ڈیزل انجن کے مختلف پرزوں کو اسمبل کرتا تھا تو وہ کہنے لگے یہاں تو اس کا کوئی کام نہیں۔ یہاں تو اسٹیل ٹکنالوجی ہے۔ نہ جانے وہ اسٹیل ٹکنالوجی کو کیا سمجھتے تھے ۔

میں جونئیرا نجینیئر تھا کچھ نہ کہہ سکا- صرف کہا "جناب میں کیا کہہ سکتا ہوں-آپ ہی لوگوں نے مجھے منتخب کیا ہے "

آج میں جب بطور چیف انجینئیر مینٹی ننس کے طور پر کام کر رہا ہوں اور کبھی کبھی یہ واقع یاد آجاتا ہے تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر آجاتی ہے -

راکٹ سازی کے دوران جو کچھ سیکھا- انجن کی اسمبلی کے دوران جو علم حاصل کیا اور اس سے بڑھ کر جو انسانی نفسیات کا ادراک ہوا اس کا ایک ایک ذرہ اگلے تیس برسوں میں میرے کام آتا رہا مثلاً

بولٹ اگر مشین کے اندر ٹوٹ جائے تو کیسے نکالیں گے - -

تیل کا فلٹر کیسے کام کرتا ہے اور اس کے اندر کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں - -

لیتھ مشین سے فیبری کیشن کا کام کیسے لیا جاتا ہے - -

بولٹ اور اسٹڈ مین کیا فرق ہے - -

تیل مین پانی مل جائے تو اس کا رنگ کیسے ہو جاتا ہے - -

سامان اٹھانے کے لئے رسی یا سلنگ کا پھندہ کیسے بنایا جاتا ہے - -

آڈٹ والے کیا سوالات پوچھتے ہیں - -

ٹرانسپورٹ کے اصول و ضوابط کیا ہوتے ہیں - -

بھوربن کا سیمینار ختم ہوئے عرصہ ہوگیا لیکن ان صاحب کی باتیں اب بھی یاد آتی ہیں کیونکہ وہ صحیح تھیں -

یقین کیجئے شیفتہ کا یہ شعر میرے لئے نہیں ہے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی

میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر میں ملے

یہ شیفتہ اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں یا میری جانب اشارہ ہے -- ٹھیک ہے کہ میں اس رات ٹبی تھانہ شاہی محلّہ میں موجود تھا----- لیکن --- لیکن -- لیکن -

ٹبی محلّہ لاہور کا وہی محلّہ جس پر ساحر لدھیانوی نے اپنی شہرہ آفاق نظم لکھی تھی

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی

پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ

یہ کوچے - یہ گلیاں - یہ نظارے دکھاؤ

ثناء خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

ثناء خوان تقدیس مشرق کو بلاؤ

میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس محلے کی بد نام خواتین بھی میرے ہمراہ تھیں لیکن بات ایسی نہیں --

بہتر ہے کہ میں سارے واقعات بتاؤں کہ میری پارسائی کو جو دھبہ شیفتہ لگا رہے ہیں وہ دھل جائے -

سمجھ نہیں آتا کہ اسے کس انداز میں رقم کروں -- سنجیدہ ہوتا ہوں تو اس دوران میں گزرے مکالمے اس تکلیف سے نجات دلانے کی جد و جہد کرتے ہیں اور کبھی مزاحیہ انداز میں لینے کی سعی کرتا ہوں تو افسوس کی پرچھائیاں اپنی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں -

خیر جو بھی ہو میں لکھ رہا ہوں کیوں کہ دور سے آوازیں سنائی دے رہی ہیں تم لکھ دو - لکھ ڈالو کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو -

اتوار 21 جون 1970 --- امروز -- مشرق لاہور یا جنگ کراچی دیکھئے - اس میں خبر چھپی ہے -

واقعہ یہ تھا کہ میں اس زمانے میں لاہور میں بیکنڈ ایر انجینئرنگ کا طالب

علم تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ امتحانات ہونے والے تھے اس لئے ہم کچھ دوستوں نے پڑھنے کا ایسا نظام الاوقات بنایا کہ رات دس بجے سو جاؤ اور دو بجے اٹھ کر تین چار گھنٹے آرام و سکون سے پڑھ لو۔

یہ غالباً ہفتے کی رات تھی اس روز بھی رات دو بجے اٹھے اور اپنے آپ کو مطالعہ کے لئے تیار کرنے لگے۔ منور نے کہا یار اب بھی نیند آ رہی ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا اور احمد خان کا بھی۔آخر یہ فیصلہ کیا کہ ایک راونڈ یونیورسٹی کا لگا لیتے ہیں--تازہ ہوا میں سیر کرنے سے تازہ ہو جائیں گے اور فریش دماغ کے ساتھ صبح تک پڑھتے رہیں گے نہ شور نہ شرابا--ٹی وی کی آوازیں بھی نہیں اور ریڈیو کے گانوں سے بھی نجات

سو یہ سوچ کر ہم باہر نکلے

کچھ دوسرے طالب علم جو جاگ رہے تھے انہوں نے کہا کہ رات دس بجے ہنگامہ ہوا تھا اور طالب علم امتحانات کی تاریخ آگے بڑھانے کا مطالبہ کر رہے تھے ۔انہوں نے وائس چانسلر کے گھر پر بھی حملہ کیا تھا اور خشت باری کی تھی۔ پولیس آ گئی تھی

خیر ہم تینوں باہر نکلے اور مین کیمپس کی طرف سے ہو کر واپس آ ہی رہے تھے کہ

چند پولیس والے ملے اور کہا کہ کہاں سے آ رہے ہو۔ ابھی ہم کچھ کہنے والے ہی تھے کہ پیچھے سے کسی اور پولیس والے نے آواز نکالی کرم علی کیا سوال جواب کر رہا ہے انہیں یہیں روک دے۔۔ اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔ وہاں کچھ اور طالب علم بھی کھڑے تھے ہمیں بھی ان کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔

کھڑے کھڑے صبح ہو گئی لیکن انھوں نے ہمیں نہیں چھوڑا۔۔۔ اتنے میں ایک پولیس ٹرک جس میں چھوٹے چھوٹے روشندان لگے ہوتے ہیں ظاہر ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک جیپ بھی پہنچی۔ جیپ میں پولیس کے کوئی اعلیٰ افسر تھے۔۔

جن پولیس والوں نے ہمیں روکا تھا ان میں سے ایک نے کہا کہ " یہ بھاگ رہے تھے۔ ہم نے انہیں بھاگتے ہوئے پکڑا ہے "

میں نے ایک دم کہا 'نہیں ہم بھاگ نہیں رہے تھے۔ ہم ڈھائی بجے جا رہے تھے انھوں نے ہمیں کھڑا کر دیا ہے اور ابھی تک روکے ہوئے ہیں "

ایسے لگا پولیس افسر نے میری بات نہیں سنی۔ چنانچہ میں نے دوبارہ کہنے کی کوشش کی جناب ہم بھاگ نہیں رہے تھے۔۔۔ " اس پولیس والے نے کہا "کیا تو نے ایک ہی بات پکڑ لی ہے۔۔ چل بیٹھ "

ہم اس چھوٹے چھوٹے روشندان والے ٹرک میں سوار ہو گئے۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ جی ٹی روڈ پر آئے۔ سبزی والے جلو سے سبزی لیکر شہر کی طرف آ رہے تھے۔ ہمیں راستوں کا پتہ نہیں چلا اور ایک گندے سے تھانے میں لا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔

کمرہ کیا تھا سمجھیں کہ باتھ روم یا بیت الخلاء تھا جس میں بند کیا گیا تھا۔ بیت الخلاء اس لحاظ سے کہ اس کمرے میں ہی ایک طرف ٹاٹ کا پردہ ڈال کر بیت الخلاء بنا دیا گیا تھا۔ دو تین قیدی پہلے سے بند تھے۔ ایک ہمارے سامنے ہی بیت الخلاء کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔ اس بیت الخلاء کا گند پیشاب بہہ کر پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم اسی گند کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ۔ ہم سب حواس باختہ تھے۔ عمریں سب کی انیس اور بیس کے درمیان تھیں۔

قیدیوں نے ہمیں تسلی دینا شروع کی ایک نے کہا یہ تالا توڑنا کیا مشکل ہے لیکن ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ انہوں نے ہی ہمیں بتایا کہ یہ ٹبی تھانہ ہے

رات کو تھانے والوں نے کہا کہ تمہیں ہم اچھا کھانا دیتے ہیں - اور داتا صاحب سے ایک دیگ منگوا کر ہمیں کھانا دیا- دوسرے قیدیوں نے کہا ،،یہ آپ کی وجہ سے ہمیں ،، ملا ورنہ ہم تو دال پر ہی گزارہ کرتے تھے

ٹبی تھانہ میں پہلی رات کے قیام کے دوران طرح طرح کے واقعات دیکھے - رات کو گیارہ بجے ایک پولیس والا آیا اور کہا "باؤ جی اب تم سو جاؤ ہمارا کام شروع ہوتا ہے- یہ -- صرف کہنے کی حدتک تھا ورنہ اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا اور ہم دیکھتے رہے

اس بدنام بازار کی خواتین کو ان کے طلب گاروں کے ہمراہ پکڑ کر لایا گیا اور طلب گاروں سے جو سلوک کیا گیا اس کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ اب وہ کبھی یہاں کا رک نہیں کریں گے -ایک پولیس والے سے کہا تو اس نے قہقہہ لگایا اور کہا " یہ اشتہاسب کو -- دوبارہ لائیگی

وہاں کے واقعات ایسے ہیں کہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا بس ان طلب گار حضرات کے کچھ مکالمے پیش کر رہا ہوں

ایک صاحب کراچی کے پکڑے گئے تھے وہ کہہ رہے تھے "میں تو داتا صاحب کے

مجرے کو جارہا تھا۔ خسم سے راستے سے واخف نہیں تھا۔ اس لئے ادھر نکل آیا - اور تم نے دھر لیا-- میں جھوٹ بولوں تو خبر میں کیڑے پڑیں" میں چونک پڑا یہ صاحب
-حیدر آباد دکن کی بولی بول رہے تھے یہاں کیسے

پولیس والوں نے کیا مکالمات بولے وہ میری سینسر کی نظر

ایک دوسرے خان صاحب پتلے دبلے سے انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا" صاحب ہم نے سمجھا یہ عورت گنڈیری منگاتا ہے-اس سے پوچھنے گیا- - بس تم لوگوں نے پکڑ لیا آگے فقرے سینسر کی زد میں آ گئے-----

ایک دھوتی پہنے صاحب کی دھوتی گیلی تھی-جانے کیا لگا تھا--اس کے مکالمات سینسر بورڈ اف دس ویب پیج کے سبب حذف

اور اس محلے کی خواتین ان سب سے لاپرواہ پھر رہی تھیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو-
ایک ایک طرف بیٹھی سگریٹ کا کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اڑا رہی تھی
جب کہ دوسری نہ جانے کونسا مشروب پی رہی تھی-ان کے طلب گاروں پر کیا بیت رہی ہے-اس سے بالکل لاتعلق-ایسے لگتا تھا یہ ان کا روزمرہ کا تماشہ تھا

خیر تین دن بعد حکام بالا کو ہم پر رحم آیا ایا اور انہوں نے ہمیں پلازہ سینیما کے سامنے پولیس لائنز کے تھانے میں منتقل کیا۔ پلازہ میں ان دنوں غالباً چنگیز خان فلم لگی ہوئی تھی۔ اندر گئے تو پولیس والوں نے ڈرایا یہاں کا ایس ایچ او ہلاکو خان ہے تم سب کو ٹھیک کر دے گا۔ جب لاک اپ میں بند کرنے لگے ایک پولیس والے نے کہا ان کی عینکیں اتار لیں ۔۔خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں " لیکن دوسرے سینیئر سپاہی نے " کہا "چھڈ منڈیاں نوں نہ ڈرا

یہ لاک اپ وہ تھا جہاں اس سے ایک دوماہ قبل مولانا کوثر نیازی مرحوم سابق وزیر ۔ مذھبی امور پاکستان پیپلز پارٹی کو رکھا گیا تھا۔ یہاں پنکھا بھی تھا اور اٹیچ باتھ بھی لاک اپ میں رہنے کے دوران کوئی پریشانی نہیں ہوئی ۔۔ پولیس والوں کا رویہ بہت ہی اچھا تھا یہاں پولیس لائنز کے تھانے میں بھی اور ٹبی تھانے میں بھی
کبھی کبھی ایک ہول اٹھتی تھی کہ ہمارا فیوچر کیا ہوگا۔ قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیلے ۔ گی ۔ کہیں ہم مستقل تو بند نہیں کر دئے جائیں گے

یہ جنرل یحیٰ کے مارشل لاء کے ایام تھے - پورے ایک ہفتے بعد پتہ چلا کہ ہمیں ایک
- کرنل صاحب کے سامنے پیش کیا جائے گا
ان کے سامنے پیش ہوئے -انہوں نے استاد کے ادب کرنے پر ایک فصیح بیان دیا اور کہا
کہ تم لوگوں کو فیشن کا بہت شوق ہے -اور ہمارے بال کٹوانے کو کہا- اسی وقت ایک
نائی کہیں سے لایا گیا اور سب کے بال چھوٹے چھوٹے کر دئے گئے- ایک معافی نامہ پر
-دستخط کرائے گئے کہ آئندہ سے ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے
مجھے دو باتوں کا افسوس ضرور ہوتا ہے ایک یہ کہ ہم نے کچھ نہیں کیا تھا اور ہم سے
معافی نامہ پر دستخط کرائے گئے دوسرا یہ کہ جب ہمیں پولیس کے چھوٹے چھوٹے
روشندان والے ٹرک پر بٹھایا جا رہا تھا تو میں نے کہا تھا کہ "ہم بھاگ نہیں رہے تھے"
میرا خیال تھا کہ اس پر پولیس افسر تحقیقات کریں گے
-لیکن ایسا نہیں ہوا

ٹریکٹر بغیر ڈرائیور کے چل رہا تھا

یہ کوئٹہ کی بات ہے۔ چھٹیاں گزارنے وہاں گیا تھا۔ شہر کے باہر ایک کھیت میں سے گزر رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اردگرد گھروں میں غالبا چولھے جلا کر رات کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دھواں فضاء میں یوں مدغم ہو رہا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بادل کہاں ہیں اور دھواں کہاں۔ شام کے دھندلکے میں درختوں کے سائے لمبے لمبے ہو کر ایک عجیب سا تاثر دے رہے تھے۔ سڑک پر یا کھیتوں میں کوئی بندہ بشر نہیں تھا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور ایک کتا آسمان کی طرف منہ کرکے عجیب سی آواز میں رو رہا تھا۔ مختصراً یہ کہ ماحول میں ایک پراسراریت کی کا احساس سا ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس ماحول اس جگہ سے جتنا جلدی ہو سکے نکل جاؤں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سیاسی حالات بھی ایسے تھے کہ خوف ہر وقت زہن سے چمٹا رہتا تھا اچانک میری نگاہ ایک لال رنگ کے ٹریکٹر پر پڑی۔ وہ پل کے قریب ایک چھوٹے سے میدان میں متواتر گھومے جا رہا ہے۔ ایک ہی رفتار ایک ہی دائرہ۔۔ اس کے اوپر ایک بڑا سا درخت جسکی کچھ شاخیں سوکھی ہوئی تھیں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ اسے کوئی چلا نہیں رہا تھا یعنی۔ کوئی ڈرائیور نہیں تھا اور وہ چلے جا رہا تھا۔ میں نے حیرت کے عالم میں ادھر ادھر

۔ دیکھا سامنے ہیں ایک قبرستان کے آثار دکھائی دئے
ایک دم خوف کی ایک سرد سی لہر جسم میں عود آئی۔ وہ سب پرانے قصے یاد آئے کیسے روحیں قبرستان میں پھرتی رہتی ہیں۔ کسی انسان سے چمٹ جائیں تو انسان مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
اس عالم میں میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ دل کی خوفزدگی میں کمی آئی۔ کچھ حوصلہ جمع کیا اور پھر غور سے ٹریکٹر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ڈرائیور کی جگہ کا جائزہ لیا یہ کیسے چل رہا ہے۔۔ کوئی ڈرائیور نہیں۔ دل میں سوچا۔ کوئی ہیولہ ہو گا جو مجھے نظر نہیں آ رہا دفعتاً میری نظر اس کے آسٹیرنگ پر پڑی۔ اسے کسی نے موٹی رسی سے تھوڑا سا گھما کر باندھا ہوا تھا اور ایکسی لی ریٹر جہاں پیر رکھ کر ٹریکٹر چلاتے ہیں وہاں دو تین اینٹیں رکھی ہوئی ہیں اوہ تمام ماجرا میری سمجھ میں آگیا
غالباً انجن پورا کھول کر اس کے پسٹن کے رنگ تبدیل کئے گئے تھے اور اب اسے بیس پچیس گھنٹے بغیر لوڈ کے چلا کر رواں کرنا تھا۔ یہ نہایت اکتا دینے والا کام ہوتا ہے۔ ٹریکٹر کے مالک نے اس کا حل یہ نکالا تھا کہ اس کے اسٹیرنگ وغیرہ کو باندھ کر اسٹارٹ کرنے کے بعد اینٹیں وغیرہ ایکسی لی ریٹر

پر رکھ کر چلا گیا تھا اسی لئے وہ گھومے جا رہا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سائیکل پر اس کا مالک نمودار ہوا۔ وہ مہارت سے چلتے ٹریکٹر میں سوار ہوا اور اسے روک کر رسی وغیرہ کھولنے لگا میں نے سر کو ایک جھٹکا سا دیا۔ میں بھی کیا کیا سوچ رہا تھا۔

مسلم یہودی تنازع

ایک یہودی کے بارے میں اللہ تعالی نے محمد صلی علی علیہ والسلم سے کہا
ہم نے اے رسول محمد صلی علی علیہ والسلم آپ پر سچائی کی ایک کتاب (قراں پاک)
نازل کیا ہے۔۔ آپ لوگوں میں اس کے مطابق فیصلہ کریں-------- اور خیانت
کرنے والے مسلمان کے حمایت نہ کریں۔
یہ آیت کب اتری اور اس کا پس منظر کیا تھا
آیئے پس منظر میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں
ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے گھر سے ایک تھیلا آٹے اور ایک زرہ بکتر چرالیا
اور اپنے گھر لے گیا لیکن بعد میں اس خوف سے کہ راز نہ افشاء ہو جائے اپنے کو بچانے
کے لئے اسے راتوں رات ایک یہودی کے گھر میں اماتناً رکھ آیا۔

۔ یہودی کو کچھ پتہ نہ تھا اس نے رکھ لیا

صبح اصل مالک نے دیکھا آٹا غائب ہے۔ اتفاق سے آٹے کی بوری میں سوراخ تھا لیکن

۔ جس مسلمان نے چرایا تھا اسے پتہ نہیں چل سکا تھا۔ چنانچہ آٹا سوراخ سے گرتا گیا تھا

اصل مالک اس گرے ہوئے آٹے کے ساتھ چلتے چلتے پہلے چور مسلمان کے گھر گیا ۔ لیکن

۔ اس نے قسم کھا کر انکار کر دیا کہ اسے آٹے کے بارے میں کچھ علم نہیں

خیر اصل مالک پھر نکلا اور گرے ہوئے آٹے کا تعاقب کرتے ہوئے یہودی کے گھر پہنچ

گیا اور وہاں سے آٹا برآمد بھی کروالیا۔ یہودی نے لاکھ کہا کہ اس نے نہیں چرایا لیکن

۔ اس یہودی کی کسی نے ایک نہ سنی

۔ یہ معاملہ ہمارے پیغمبر محمد صلی علی علیہ والسلم کے سامنے پیش ہوا

چور مسلمان اور اس کے ساتھیوں نے اپنے کو بچانے کے لئے طرح طرح کے حربے

۔استعمال کئ اور محمد صلی علی علیہ والسلم کو غلط باتیں بتائیں

مسلمان چور کے ساتھیوں نے دلائل دئے یہ یہودی حق کا انکار اور رسول سے کفر کرنے
- والا ہے۔اس خبیث کی بات کا کیا اعتبار کریں۔ ہم مسلمان ہیں ہماری بات تسلیم کریں
اس پر قریب تھا کہ محمد صلی علی علیہ والسلم یہودی کے خلاف فیصلہ دے دیتے کہ قران
کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ محمد صلی علی علیہ والسلم اور دوسروں کو بتایا گیا کہ چور یہی
- مسلمان ہے------ یہودی اس معاملے میں سچا اور بے گناہ ہے
چنانچہ ان آیتوں میں یہی بات کی گئ ہے کہ اے محمد صلی علی علیہ والسلم ہم نے ایک
سچی کتاب اتاری ہے اس کے کہنے کے مطابق۔لوگوں میں چاہے وہ کافر ہوں یا مسلمان--
انصاف سے کام لیا جائے اور جو جھوٹے ہیں ان کی بات کا اعتبار اور طرفداری نہ کریں۔
-ان دغا باز مسلمانوں کی سائیڈ لیتے ہوئے یہودی کو مجرم نہ قرار دیں۔
-قران مجید کی جس ایت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا

سورہ النساء -- آیت ١٠٥

آیت پاک کا ترجمہ قران پاک "احسن القران" شائع کردہ لاہور / ریاض سعودی عرب سے کیا گیا ہے۔

تشریح کے لئے تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابواعلیٰ مودودی کی تفہیم القران سے مدد لی گئی ہے۔

مشتری ہشیار باش

میں دو تین ویلفیئر اداروں سے تعلق رکھتا ہوں جہاں ضرورت مند طالب علموں کی امداد کی جاتی ہے۔نادیہ ذوالقرنین بھی ایک ایسی ہی طالبہ تھی۔ اس نے انجینئرنگ کا امتحان پاس کر لیا تو یہ مدد بند کردی گئی۔ وہ ایک مقامی چھوٹے سے صنعتی ادارے میں ملازم ہو گئی۔ لیکن کبھی کبھار اس کے فون آجاتے تھے۔ وہ بہت خوش تھی۔
ایک روز نادیہ کا فون آیا کہ اسے دوبئ میں ایک بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ یہ نوکری ایک بہت بڑی ریفائنری میں ہے اور اب وہ اپنے ویزہ وغیرہ کے معاملات طے کرنے جارہی ہے۔ویزہ وغیرہ کے معاملات طے کرنے کے لئے اس خط کے مطابق دوبئ کی ایک کمپنی عمیر ٹریولز کو مقرر کیا گیا ہے۔۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ویزہ وغیرہ کے معاملات طے کرنے کے لئے کچھ پیسے اس ٹریول ایجنسی کو دینے پڑیں گے
۔

میں ایک دم چونک گیا۔۔ میرے منہ سے نکلا "کیا؟
جہاں پہلے پیسے ادا کرنے کا معاملہ ہو وہ عموماً دھوکا ہی ہوتے ہیں لیکن

نادیہ کے مطابق عمیر ٹریول ایجنسی دوبئی کی بہت بڑی ٹریول ایجنسی ہے جہاں دھوکے کا احتمال کم تھا۔ " نادیہ نے کہا۔ اس نے کچھ پیسے جمع کر لئے ہیں

میرے ساتھ میرے دوست خلیل بھی بیٹھے یہ گفتگو سن رہے تھے انہوں نے بھی کہا کہ عمیر ٹریولز تو بہت بڑی ٹریولنگ کمپنی ہے۔ یہاں دھوکا بازی وہ بھی ایسے معاملات میں ناممکن ہے۔

خیر میں نے نادیہ سے کہا کہ اپنا اپوائنٹمنٹ لیٹر مجھے فارورڈ کرے۔

آئل کمپنی کے لیٹر ہیڈ کے چار صفحات پر مشتمل یہ لیٹر دیکھا۔ نوکری میں جو مراعات دی جارہی تھیں اسے دیکھ کر تو کسی ملک کا صدر بھی اپنے ملک کی صدارت چھوڑ کر نوکری جوائن کرلیتا۔

جس کمپنی کی طرف سے یہ اپوائنٹمنٹ لیٹر جاری ہوا تھا وہ یو اے ای کی بہت بڑی آئل کمپنی تھی

اس میں لکھا تھا کہ ویزے وغیرہ کے معاملات یو اے ای کی ایک ٹریولنگ ایجنسی عمیر ٹریول کر رہی ہے۔

سب سے پہلے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آئل کمپنی نے ہر صفحے کے لئے پہلا کورنگ پیج ہی استعمال کیا ہے جبکہ دوسرے تیسرے پیج کے لئے "کنٹی نیویشن" کا پیج استعمال کیا جاتا ہے اس پر صرف کمپنی کا چھوٹا سا نام اور -- مونو گرام بنا ہوتا ہے -

جو پہلا پیج تھا اس پر کوئی مونو گرام وغیرہ نہیں تھا -ایک مونو گرام مدھم سا پیج کے درمیان میں بنا تھا جیسا کہ کچھ لیٹر ہیڈ پر ہوتا ہے -

پہلے پیج پر ایک لینڈ لائن نمبر اور ایک فیکس نمبر سب سے اوپر چھپا تھا- پیج کے اختتام پر ایک حاشیہ یا مارجن بنایا گیا تھا- لیکن حیرت ہوئی کہ اوپر جو نمبر فون نمبر کے طور پر لکھا گیا تھا نیچے اسے فیکس نمبر کے طور پر ظاہر کیا گیا تھا اور فون نمبر کوئی تیسرا درج کیا گیا تھا- اتنی بڑی غلطی اتنا بڑا ادارہ نہیں کر سکتا-- ایک بڑا ادارہ ان سب باتوں کا بہت خیال رکھتا ہے -

پھر فون نمبر لکھنے کے انداز میں بھی فرق تھا- اوپر پانچ-دو- تین- اور چار ھندسوں کے گروپ بنا کر لکھے گئے تھے اور نیچے پانچ-دو چار اور تین

ھندسوں کے گروپ بنائے ہوئے تھے۔ اچھے ادارے ان سب امور کے بارے میں نہایت سنجیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں کوئی ایسا معاملہ نظر نہیں آرہا تھا۔۔ یہ سب باتیں شکوک کو جنم دے رہی تھیں۔

ان کا کہنا تھا کہ بھئی یہ ٹریول ایجنسی تو بہت بڑی اور مشہور ہے۔

خیر اپوائنٹمنٹ لیٹر میں ٹریول کمپنی کا ویب سائٹ ایڈریس بھی تھا اسے کلک کیا تو چانک پورا اسکرین سفید ہو گئی اور ایک کونے میں لکھا آیا کہ اس سائٹ کو دیکھنے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔

ہم ایک دم چونک گئے۔ خلیل صاحب چائے کی چسکیاں لے رہے تھے چائے کی پیالی ان کے ہاتھ میں تھی لرز گئی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی بڑی ٹریول کمپنی اور اس کی ویب سائٹ کہے کہ آپ نہیں دیکھ سکتے"

ہٹو ہٹو میں اسے کاپی کرکے پیسٹ کرتا ہوں اور کھولتا ہوں" انہوں نے کہا لیکن انہیں بھی یہی جواب ملا۔

پھر ہم نے ریورس پراسیس شروع کیا۔ عمیر ٹریول ایجنسی کے نام سے سرچ انجن

۔میں ڈالا۔ کلک کیا۔ لکھا آیا کہ دوبئ کی بڑی ٹریول ایجنسیوں میں سے ایک
پھر اس کے بعد عمیر ٹریول ایجنسی کی ویب سائٹ نکالی تو۔ حیرت زدہ رہ گئے ۔ اس کے
۔ فون نمبر اس سے جدا تھے جو آپوائنٹمنٹ لیٹر پر لکھے تھے
۔ ان کے ای میل ایڈریس لکھنے کا انداز اس سے الگ تھا جو آپوائنٹمنٹ لیٹر پر تحریر تھا
۔اس کا ویب سائٹ آیڈریس بھی الگ تھا
تب اندازہ ہوا کہ عمیر ٹریول ایجنسی کا نام دکھا کر دھوکا دیا جارہا ہے لیکن اس نام سے
ویب سائٹ نہیں بنا سکتے تو اس کی پردہ پوشی اس طرح کی جارہی ہے کہ اس پر جانے کی
آپ کو اجازت نہیں ہے۔ کوئی تجارتی ادارہ اپنی ویب سائٹ بالکل دکھائے ہی نہیں ۔ یہ
۔ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا پاکستان بھارت مڈل ایسٹ میں رات کو سورج کا نکلنا
خیر مزید تحقیق کے لئے ٹریول کمپنی کے بعد اس آئل کمپنی کی ویب سائٹ کو کھولا گیا۔
انکے لیٹر ہیڈ کا معائنہ کیا گیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو

-اس نوکری دلانے والے ادارے کا انٹرویو دینے کے بعد جاری ہوا تھا

اس آئل کمپنی کی ویب سائٹ کا مزید جائزہ لیا گیا تو ایک جگہ اعلانات کا باکس نظر آیا- وہاں جا کر دستک دی تو پہلا جو اعلان نکلا وہ یہ تھا کہ مشتری ہشیار باش- نوکری دلانے کے بہانے ہماری طرف سے جھوٹے کاغذات پر بنا کر اپوائنٹمنٹ لیٹر ایشو کئے جا رہے ہیں- ہم جب نوکری دیتے ہیں تو طبعی طور پر فزیکلی آمنے سامنے بیٹھ کر انٹرویو لیتے ہیں-

آئل کمپنی--ابو ظہبی نیشنل آئل کمپنی (ایڈنوک) نے نوکری کے خواہش مند افراد کو ایسی جعلی نوکری دلانے والے اداروں سے بچنے کے لئے جو انتباہی اعلان جاری کیا ہے اسے اس-ابو ظہبی نیشنل آئل کمپنی (ایڈنوک) کی اس ویب سائٹ پر پڑھ لیجئے-

اللہ سے دعا ہے کہ ہم سب کو اس قسم کی جعل سازیوں کا شکار ہونے سے بچائے اور ہم بھی محتاط ہو کر قدم آگے بڑھائیں-

http://www.adnoc.ae/publications/eppublications/ADNOC_Adv_english.pdf

ناسا کے سائنسدانوں سے سورہ القارعہ تک

میں جب بھی سورہ القارعہ پڑھتا ہوں تو امریکہ کے سائنسدانوں کی ناسا رپورٹ سامنے گھومنے لگ جاتی ہے --اور اسی طرح جب بھی امریکہ کے سائنسدانوں کی ناسا رپورٹ پڑھتا ہوں تو سورہ القارعہ سامنے آجاتی ہے

آخر ماجرا کیا ہے

آج سے پندرہ بیس سال پہلے ایک خبر امریکہ خلائی تحقیقاتی مرکز سے آئی تھی کہ کسی خاص تاریخ کو دو سیارے آپس میں ٹکرائیں گے جس کے سبب ان سیاروں میں بہت ہی زیادہ تباہی مچے گی اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس کے اثرات زمیں پر بھی پڑ سکتے ہیں۔ ناسا والوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ زمین سے ان کی حرکات کو کنٹرول کرکے انہیں مدار میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سائنسدان سر توڑ کوشش کے باوجود ان کی حرکات پوری طرح قابو میں نہیں کرکے ان کی سمت میں تبدیلی ضرور آئی لیکن پوری کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی۔ناسا کے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ ان کے ٹکرانے کے امکانات موجود ہیں۔ ہاں یہ

-ہو سکتا ہے کہ کہ انکے آخری سرے یعنی کونے آپس میں ٹکرائیں
آخر وہ دن آگیا جب ان دو سیاروں کا ٹکراؤ ہونا تھا
اس روز سائنسدانوں نے طرح طرح کے کیمرے- درجہ حرارت ناپنے والے آلات- آواز کی پیائش کے لئے مشینیں- مختلف گیسوں کا جائزہ لینے والے انسٹرومنٹ لگائے ہوئے تھے انکی نگاہیں دوربین میں ٹکی ہوئی تھیں یا پھر کمپیوٹر اسکرین پر لگی ہوئی تھیں- -کچھ سائنسدان مختلف میٹروں پر نظر جمائے بیٹھے تھے
ستاروں کے ٹکرانے کے بعد کی رپورٹ جب جنگ اخبار کے سنڈے میگزین میں پڑھی تو -حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا
مجھے ایسے لگا کہ میں سورہ القارعہ کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں-- ان کے ٹکرانے سے جو گونج پیدا ہوئی ہمارے کان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے-- جیسے ہی دو سیارے ٹکرائے ایک دھماکہ ہوا-- ٹکرانے کے باعث رگڑ سے جو حرارت پیدا ہوئی وہ حافظ الاماں-- کئی اسٹیل ملوں کی بھٹیوں کی حرارت بھی اس کے سامنے ہیچ تھی-- سیاروں کے کونوں کے .بڑے.بڑے ٹکڑے مہیب ہولناک آواز کے ساتھ , روئی

کے گالوں کی طرح اڑنے لگے -- یہ ٹکڑے خود بھی آپس میں ٹکرا رہے تھے اس سے جو گرد اڑ رہی تھی اور گرداب بن رہا تھا۔ اس میں چنگاریاں ہی چنگاریاں تھیں اس تیز رفتاری سے آڑتی ہوئی چنگاریوں کے دہکتے الاؤ کے اندر جو مصیبت پنہاں تھی، گرمی کا جو عفریت تھا وہ سائنسدان ہی جانتے تھے --

رپورٹ پڑھ کے میں سوچ رہا تھا۔ اگر زمین کا ٹکراؤ کسی سیارے سے ہو جائے تو ہماری کیا کیفیت ہو گی۔ ہم بھی لاچار ہو کر ایسے ہی ہوا میں آڑ رہے ہونگے۔ ہمارے پہاڑ بھی ایسے ہی روئی کے گالوں کی طرح فضاء میں بکھر رہے ہونگے۔ گرمی کی حدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہونگے۔ دھول سے کیسے بے دم ہو ہو کر ہم گر رہے ہونگے۔ اگر کسی الاؤ میں پھنس گیا تو------- یہ تصور کرتے ہی خوف کے سبب میں تھرا کے رہ گیا میری عجیب سی حالت ہو گئی۔ایک جھر جھری سی آ گئی۔

سورہ القارعہ کیا ہے۔

اس کا مفہوم کچھ ایسے ہے

دل کو دہلا دینے والا منظر کیا ہے کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ وہ کیا

نظارہ ہوگا۔ وہ کیسا دن ہوگا جب انسان اپنے کو بچانے کی جد و جہد میں ہوا میں لاچار کیڑے مکوڑوں کی طرح ادہر ادہر ہاتھ پاوں مارتے ہوئے اڑ رہا ہوگا ۔ یہ قیامت کا دن ہوگا جب بڑے بڑے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضاء میں اڑ رہے ہونگے اور وہ دہکتی آگ یا الاؤ کا تو تزکرہ ہی کیا جو وہاں ہوگا اور جن افراد کی حرکتیں دنیا میں صحیح نہیں ۔ ہوں گی وہ اس میں گریں گے

میں سمجھتا ہوں کہ آللہ تعالی جو کچھ سورہ القارعہ میں کہہ رہا ہے اس کا ایک ٹریلر ناسا کے امریکی سائنسدانوں کے ذریعے دنیاکے تمام انسانون کو بتا دیا ہے

الْقَارِعَةُ (۱

مَا الْقَارِعَةُ (۲

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ (۳

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۴

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ (٥

فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ (٦) فَهُوَ فِي

عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ (٧) وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (٨

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (٩) وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ (١٠) نَارٌ حَامِيَةٌ

28 جولائی --پوری دنیا میں ہیپاٹائی ٹس کا دن

کچھ نئے پہلوؤں سے جائزہ

امیتابھ بچن کا گانا سن رہا تھا

میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے- جو ہے نام والا وہی بدنام ہے

یہ گانا مجھے کبھی پسند نہیں رہا بلکہ میرے ایک مرحوم رشتے دار نے جب پہلی مرتبہ

اسے سنا تھا تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا "واہیات گانا ہے-- بند کرواے "

لیکن گانوں کے ساتھ آج کل ایک اور اختراع کی جاتی ہے جسے ری مکس کرنا کہتے ہیں-

چنانچہ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں اس گانے کا ری مکس سن رہا تھا

لیکن اچانک مجھے محسوس ہوا کہ گانا خود بخود مزید مکس ہوتا جا رہا ہے- - میری نگاہیں

ٹی وی کے اسکرین پر ہی تھیں- یہ جو ری مکس ہو رہا تھا ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو رہا تھا

- یا یہ میرے اپنے ذہن کا کوئی مسئلہ تھا کہ مجھے مزید ری مکس ہوتا محسوس ہو رہا تھا-

یہ عمل جاری رہا- جانے اصل بول

- کہاں رہ گئے اب جو مجھے سنائی دے رہا تھا وہ یہ تھا

میرے انگ میں لیور کا بہت کام ہے

جو ہے کام والا وہی ناکام ہے

لیکن وہی انداز وہی لے - وہی موسیقی کا اتار چڑھاؤ- لیکن بول دوسرے

میرے انگ میں لیور کا بہت کام ہے -- جو ہے کام والا وہی ناکام ہے

اچانک میری نگاہ ایک پوسٹر پر پڑی جو اسکرین کے کونے میں نظر آ رہا تھا- مجھے ایسے لگا

-کہ یہی پوسٹر ہے جو اس تبدیلی کا باعث بنا ہے

پوسٹر نے جو بتا رہا تھا کہ اے جنتا اے عوام - اے لوگو- یہ کام کا لیور خراب ہو جائے تو

ہیپاٹائٹس کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور 28 جولائی کو پوری دنیا ہیپاٹائٹس کا دن منا رہی

-ہے

کلیجی یعنی لیور خوں صاف کرنے کے کام آتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اسے ڈی آکسیڈائز

- کرتا ہے

زیادہ مقدار میں کوئی دوا پی لی جائے --یا کسی دوا کو مسلسل استعمال کیا جائے - یا
شراب نوشی کثرت سے کی جائے یہاں تک کہ کافی زیادہ نوش کر لی جائے تو اس کے
- اثرات خوں میں شامل ہو جاتے ہیں تو لیور یعنی کلیجی انہیں الگ کرتی ہے
اس کے علاوہ لیور شوگر پروٹین وغیرہ لیکر انہیں ان اشیا میں تبدیل کر دیتی ہے جنکی انگ
کو ضرورت ہوتی ہے- یہ ایک اسٹور کا کام بھی کرتی ہے اور اپنے اندر وٹامن --
ھارمونز- کولیسٹرول کا ذخیرہ محفوظ کر لیتی ہے اور بوقت ضرورت سپلائی کرتی رہتی
- ہے

لیور کا ایک ملحقہ حصہ تلی یا اسپلین ہوتا ہے- جو خوں کے ناکارہ سیلوں سے "بلی
روبن" نامی چیز بناتے ہیں- یہ ایک نارمل عمل ہے- بلی روبن کلیجی یعنی لیور- میں
- منتقل ہوتے رہتے ہیں
- یہاں لیور ان "بلی روبن" کو تبدیل کرکے ایک اور شے بناتا ہے جسے بائل کہتے ہیں

یہ بائل بڑی آنت میں جا کر خدمت خلق کے جذبہ کے تحت چکنائی (فیٹ) ہضم کروانے کو مائل بہ کرم رہتا ہے۔ بائل یہ احسان کرنے کے لئے ایک خصوصی پائپ یا ڈکٹ استعمال کرتا ہے۔ کبھی یہ ڈکٹ یا پائپ--- لیور---- میں خرابی کے سبب بند ہو جاتی ہے تو یہ بائیل اپنا ویلفیئر والا کام نہیں کر سکتا۔اس بائل کی منتقلی کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن ادھر تلی اپنا بلی ربن کا عمل جاری و ساری رکھتا ہے۔ سو یہ بلی روبن خوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

خوں سے اپنے ارد گرد کے ٹشو مثلا جلد وغیرہ میں چلا جاتا ہے اور یوں جلد کا رنگ زردی مائل ہو جاتا ہے۔

اس پر لوگ باگ شور مچاتے ہیں کی جانڈس ہو گیا یرقان ہو گیا۔ جبکہ یہ یرقان کلیجی کے خراب ہونے کے سبب سے ہوا ہے اس لئے ایسا جانڈس جو لیور کے خراب ہونے سے ہو اسے ہیپاٹائیٹس کہتے ہیں اس کا علاج کیا ہے وہ تو ڈاکٹر ہی صحیح دوا بتا سکتے ہیں لیکن اللہ تعالی نے ایک شے ہمیں تحفے میں عطا کی ہے اور وہ ہے مولی۔ بھارت کے اپنے زمانہ کے مشہور رسالہ "بیسویں صدی" کے ایڈیٹر نے ایک کتاب "صحت اور زندگی" لکھی تھی اور اس میں کہا تھا کہ فوائد

کے اعتبار سے مولی اس قدر فائدہ بخش ہے کہ پیٹنٹ سے پیٹنٹ دواوں کی بڑی بڑی شیشیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں -

مولی کے پتوں کو ابال کر چائے بنالیں ان کی جڑوں کو بھی ڈال لیں تو بہتر ہے - اسے مریض کو پلانے سے یرقان میں کمی واقعہ ہوتی ہے یا پھر مولی کے پتے لیکر اسے پیس کر پیسٹ سا بنالیں اور اسے نہار منہ پی لیں -

پپیتے کو بھی یاد کریں- - جاپانی تو اسے کبھی نہیں بھولتے اور کہتے ہیں کہ پپیتے کے بیج لے کر انہیں پیس لیں تاکہ اس کا جوس سا بن جائے -- یہ جوس لیموں کے رس کے ساتھ ملا کر دن میں ایک مرتبہ مریض کو پلائیں کافی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ رکھیں- اس میں گلو کو سملا کر مریض کو پلائیں - کافی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے-

کسی کو یہ مرض ہو جائے تو کیا علامات ظاہر ہوتی ہیں

کچھ تو عمومی علامات ہوتی ہیں جیسے جلد کی رنگت قدرے پیلی محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ہی بخار بھی ہو جاتا ہے -

پیٹ کے اوپر داہنی جانب نرماہٹ محسوس ہوتی ہے لیکن یہ ماہر ڈاکٹر ہی بتا

سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پسلی کے نیچے دائیں جانب مریض کو درد بھی ہوتا ہے۔

بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ جوڑوں میں درد ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ

جب مرض میں اضافہ ہوتا ہے تو مریض کو شدید بے چینی محسوس ہوتی ہے جس کے سبب وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے۔

اسے صحیح سمجھنے یا سوچنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بچوں کو دیکھا گیا ہے کہ کلاس میں سب سے اچھے جارہے ہوتے ہیں لیکن اس مرض کا شکار ہونے کے بعد ایک دم کئی مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ بالکل کچھ نہیں آتا۔ ٹیچر حیران ہوتے ہیں اور ماں باپ سے شکایت کرتے ہیں کہ یہ ایک دم کیوں بھول جاتا ہے اور ایک دم کیوں اس بچے کا ذہن کیوں خالی یا بلینک ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کو بھی سمجھ نہیں آتا کیوں ایسا ہو رہا ہے جب کہ اصل محرک یہی ہیپاٹائٹس کا مرض ہوتا ہے۔

ہیپاٹائٹس کی آخری علامت مریض کے جسم میں بے تحاشہ خارش کی صورت میں نمودار ہوتی ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرض کافی شدت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا سائنسی سبب خون میں بلی ربن کا کثیر تعداد میں موجود ہونا ہے۔

جلد میں یہ کھچاوٹ۔ سنسناہٹ یا خارش رات کو سوتے وقت یا دن کو بھی سوتے وقت زیادہ محسوس ہوتی ہے جس کے سبب مریض کی نیند متاثر ہوتی ہے اور وہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر سے رابطہ کرکے دوائیاں لے سکتے ہیں۔ اپنے طور پر اسے کم کرنی کی ایک کوشش یہ ہو سکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانی پیا جائے تاکہ جسم کے اندر نمی رہے یا وہ ہائیڈریٹڈ رہے۔

کپڑے کھلے ڈھیلے ڈھالے پہنیں اور اگر کاٹن کے ہوں تو زیادہ بہتر ہے

اس سے بچنے کے لئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں

ہیپاٹائٹس کی چار۔ پانچ اقسام ہیں

ہیپاٹائی ٹس اے تو گندے پانی۔ گلی سڑی خوراک انسانی یا جانور کے فضلے کے سبب ہوتا ہے۔ اس لئے اس بارے میں احتیاط کریں۔ بچے دانتوں سے اپنے ناخن کترتے رہتے ہیں اس سے یہ پیٹ میں جا کر اس مرض کا محرک بن سکتے ہیں۔ بچوں کو "پاٹی واٹر" یا آب دست" کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور ان سے کہا جائے کہ "" اس کے بعد اپنے" ہاتھ صحیح طریقے سے دھولیں خصوصاً ان بچوں کو بہت زور دیا جائے جو دانتوں سے ناخن کترتے رہتے ہیں۔ بڑے شہروں میں اب مسلم شاور استعمال کئے جاتے ہیں ان کے استعمال سے بچے کو صحیح طریقے سے آگاہ کیا جائے

کیونکہ فضلہ اگر اپنے مقام سے صحیح طریقے سے صاف نہیں ہوگا تو بعد میں

- خارش کا باعث بنے گا اور بچوں کے ناخن میں جمع ہو جائے گا
ہیپاٹائی ٹس بی غلط طور پر جنسی تعلقات کے سبب ہوتے ہیں۔ یا ایسی مائع شے کے جسم
- میں داخل ہونے سے ہوتے ہیں جس میں خون کی آمیزش ہو
ہیپاٹائی ٹس سی خون کے سبب پھیلتا ہے۔یعنی انجکشن کی سوئی۔۔ شیونگ کے ریزر۔
بال کاٹنے والے کے اوزاروں کے ذریعے۔۔ایک اہم بات یہ ہے کہ بیوٹی پارلر میں کئی
- مرتبہ ایسے اوزار استعمال ہوتے ہیں جن میں ایک آدھ خون کا قطرہ لگ جاتا ہے
کام کرنے والی خواتین کاریگر اسے صرف ٹشو پیپر سے صاف کرتی ہیں اور اس کے بعد
دوبارہ اسی سے کام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے اسٹیر لائز کرنے کی ضرورت نہیں
محسوس کرتیں۔ ان خاتون کارکنوں سے بات کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں کسی بھی
کورس میں اس بارے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کو نہیں کہا گیا۔ یہ حیرت کی
بات ہے کہ لیڈی ڈاکٹر بھی انہی بیوٹی پارلروں سے اپنا میک اپ کرواتی ہیں انہوں نے
- بھی اس طرف کسی کی توجہ مبزول نہیں کرائی

ہیپاٹائی ٹس سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بچوں کو وقت پر اس کے حفاظتی ٹیکے لگوائیں جائیں۔ اس سلسلے میں پاکستان اسٹیل مل نے ایک مرتبہ بہترین انتظام کیا تھا اور اس قسم کے مدافعتی ٹیکے تمام ملازمین اور انکے بچون کو لگوائے تھے اور پانچ سال بعد انہیں دوبارہ ٹیکے لگوا کر انکا حفاظتی کورس مکمل کر دیا تھا۔

قوم کا وقار

یہ قوم کا وقار کیا شے ہوتا ہے -- یہ کہاں سے ملتا ہے -- یہ افراد کی اپنی سعی و جد و جہد سے حاصل ہوتا ہے یا قوم کا سربراہ حاصل کرکے طشتری میں پیش کر دیتا ہے

میں کنفیوز ہوں

لیکن کہیں دور سے ہواؤں کے دوش پر مادام نور جہاں مرحومہ کا گیت میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ کچھ الفاظ کی ترمیم کے ساتھ

ایہہ قوم دے وقار۔ عزت۔ مرتبے ہٹاں تے نہیں وکدے۔

کی لبھنی اے وچ بزار کڑے

ایہہ قوم دے وقار عزتاں مرتبے وکاؤ چیز نہیں کہ مول دیکے پا لئے نی

نہ ایویں ٹکراں مار کڑے

ایہہ ایڈا سستا مال نہیں کہ کدھروں جاکے منگ لے آیئے
ایہہ سودا نغد بھی نیہں ملدا۔ تو لبھدی پھرے ادھار کڑے
ترجمہ
۔ یہ قوم کا وقار ایسی چیز نہیں کہ دکانوں میں ملے
اے قوم تو اسے بازاروں میں کیوں ڈھونڈ رہی ہے
یہ بکنے والی جنس نہیں کہ بازار سے قیمت ادا کرکے لے آئیں
سوا اے قوم غلط جگہ پر ٹکریں نہ مار
یہ اتنا آسان سودا نہیں کہ کہیں سے بھی جا کر مانگ لائیں
نہ یہ نقد ملتا ہے نہ ہی ادھار
اس کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی ہے
تب ایک طاہر اترتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ قوم کو اپنا وقار بنانے کے لئے مشقت اور اپنے
۔ نفس کو مارنے کے کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے
ملک کے سربراہ اچھے ہوں تو وہ ان امتحانوں کے ریگزاروں سے باآسانی قوم کو

نکال لے آتے ہیں۔ لیکن سربراہ لالچی ہوں اور اپنی حکمرانی کو دائم کرنے میں لگے ہوں تو اقوام اپنی منزل سے دور مزید دور ہوتی جاتی ہیں۔

لیکن اس عالم میں میں ایسے کوشش کاروں کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کو بیدار کریں انہیں بتائیں کہ کون تمہاری پریسٹیج چھین رہا ہے۔ کیسے تمہیں دنیا کے سامنے شرمندہ کر رہا ہے۔ کیسے اپنی جھوٹ کا سہارا لیکر تمہارے وقار کو تاراج کر رہا ہے۔ جمہوریت جو اقوام کو دنیا میں احترام دلانے کا ایک ضروری فیکٹر ہے کیسے جعل سازی سے پیش کرکے دنیا کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرکے وقار کو مزید نیچے گرانے کا باعث بن رہا ہے۔ تعلیم سے کیسے دور رکھ کر وقار کو سوکھے پتوں کی طرح منتشر کر رہا ہے

عوام کا کام ہے کہ ایسے بیدار کرنے والوں کی آواز سنیں۔

ملالہ بمقابلہ ایک بے نام لڑکی

ایک کہانی جسے ہر سال لاکھوں بچے پڑھتے ہیں لیکن اس کی ہیروئن کا نام کسی کو معلوم نہیں

اس دنیا کے طویل و عریض کینوس پر بہت سے افراد ہیں جنھوں نے سچائی اور حق کی خاطر صعوبتیں جھیلیں لیکن کسی کا پتہ چل سکا کسی کا نہیں

لیکن کیا اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقتیں غائب ہو گئیں

نہیں -- ہرگز نہیں

البتہ اللہ نے ہمیں بتا دیا کہ ہم کتنے لاچار ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ مشرق سے مغرب --- شمال سے جنوب میں کیا ہو رہا ہے --- یا معلوم ہو بھی جاتا ہے تو کئی مرتبہ کچھ ایسے گورکھ دھندے درمیان میں آ جاتے ہیں کہ ہم انہیں پار ہی نہیں کر سکتے ۔

گاندھی جی کا معاملہ ہی دیکھیں ۔ ساری دنیا نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا لیکن پاکستان نے کبھی مان کے نہیں دیا ۔

پاکستان میں ہی کتنے لوگ پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری کے حقدار بنتے ہیں لین ہم انہیں جانتے بھی نہیں اور ہم نے وی آئی پی کلچر کے دلدادہ رحمان ملک کو یہ ڈگری عطا کر دی قومی اداروں میں ڈھونڈیں تو کئی ایسے لوگ مل جائیں گے جو خاموشی سے کام کئے جا رہے ہیں بغیر کسی ستائش کی تمنا کے -- بس ایک ہی آرزو کہ ملک صحیح چلے ادارہ صحیح چلے -- ارد گرد ڈھونڈیں -- کئی ایسے چہرے ہیں جو آپ کے ساتھ سے گزر گئے اور آپ کو خیال تک نہیں آیا کہ اس فرد نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا -

ملالہ کا نام ہر ایک جانتا ہے- لیکن کیا اس خاتون کا نام کسی کو پتہ ہے جس کا تذکرہ ہر برس لاکھوں بچے پڑھتے ہیں نام کا -

کسی کو علم نہیں -- نہ پڑھانے والوں کو نہ ہی پڑھنے والوں کو ---- جی ہاں تاریخ اس عورت کا نام نہیں جانتی جس نے راجہ داہر کی جیل سے حجاج بن یوسف کو خط لکھا اور ہندوستان میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث بنی- کوئی اس کا ذکر تاریخ سے نہیں نکال سکتا - خلوص والے فتنے کے دور میں چراغ ہوتے ہیں چاہے لوگ تسلیم کریں نہ کریں- انہیں اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری عطا ہو یا نہ ہو -- انہیں نوبل پرائز ملے نہ ملے -

مختار مسعود نے کیا خوب کہا ہے

یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ ان کو اس بات سے دلچسپی نہیں کہ وہ یاد رکھیں جائیں یا بھلا دیۓ جائیں۔ غرض ھے تو یہ ہے کہ اس بے ڈھب دنیا کو کیوں کر ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ھوتا ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے اگر اس کا آج کل سے بہتر نہیں۔

کیا پاکستان کو ایسی شخصیت کی ضرورت ہے ؟

لولا ڈی سلوا ----- برازیل کے سابق صدر

بہت پہلے ایک خبر نظر سے گزری تھی کہ کراچی یونیورسٹی میں طلباء نے ایک جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنی ڈگریاں لینے سے انکار کر دیا تھا - سبب یہ بتایا گیا تھا کہ ایک میٹرک پاس گورنر کے ہاتھوں ڈگری وصول کرنا علم اور ڈگری کی بے توقیری ہے اسوقت سے ایک سوال ہمیشہ میرے ذہن میں کلبلاتا رہا کہ کیا ڈگری عطا کرتے وقت ڈگری دینے والے کی شخصیت کا پڑھا لکھا ہونا لازمی امر قرار دیا جائے ؟ تو کیا پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کرتے وقت ڈگری عطا کرنے والی شخصیت بھی پی ایچ ڈی ڈگری کی حامل ہو ؟

آخر ایک دن تنگ آ کر میں نے تاریخ سے اس کا جواب جاننا چاہا۔ ماضی بعید کو کھنگالنے کی بجائے ماضی قریب میں گھوما اور پتہ چلا کہ ابھی صرف چار سال پہلے ہی ایک شخصیت گزری ہے جو بالکل پڑھی لکھی نہ تھی لیکن بطور وزیر اعظم اس نے ایسے کارنامے انجام دئے کہ ایسے افراد سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک گونہ فرحت - - ایک دلی مسرت۔ ایک انجانی راحت کا احساس ہوتا ہے

یہ شخصیت تھی برازیل کے صدر۔ لولا ڈی سلوا کی

انکا پیدائش کا مہینہ ہے اکتوبر۔ جب بھی اکتوبر کا مہینہ آتا ہے تو اس ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں کے نام میرے سامنے گھومنے لگ جاتے ہیں۔ کیسی کیسی ہستیوں نے اس ماہ جنم لیا جنھوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ مہا تما گاندھی۔ بل گیٹس۔ امریکی صدر روز ویلٹ۔ امیتابھ بچن۔۔اور اب ان میں نیا نام لولا ڈی سلوا کا جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔

اکتوبر-27-1945 میں پیدا ہونے والے لولا ڈی سلوا کا بچپن نہایت نامساعد حالت میں گزرا۔ پیدائش کے بعد والد خاندان کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسا۔ پیچھے رہ جانے والے بچوں اور بیوی پر کیا گزر رہی ہے اس کی پرواہ ہی نہیں کی۔ آخر بیوی نے خود ہی ادھر ادھر سے اپنے شوہر کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ایک کھلے ٹرک پر اپنے بچوں بشمول لولا ڈی سلوا کو لے کر تیرہ دن کی مسافت کے بعد شوہر کے پاس پہنچی تو یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس وفا کی پتلی نے کوشش کی کہ کسی طرح اسی گھر میں رہ جائے لیکن یہ نہ ہو سکا۔ تب وہ پھر اپنے بچوں کو لیکر دوبارہ نکلی اور ایک شراب خانے کے نچلے کونے میں زندگی کے دن بتانے لگی

یہ وہ حالات تھے کہ گھر میں کھانے کے لالے پڑ گئے۔ ایسے میں تعلیم کہاں اور اسکول کہاں۔ دس سال کی عمر تک یعنی 1955 تک تو لولاڈی سلوا اپنی زبان کی الف بے بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ لیکن ماں نے کسی نہ کسی طریقے سے اسے اسکول میں داخل کر دیا کہ پڑھ لے۔ لیکن گھر کے معاشی حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ مجبوری کے عالم میں لولاڈی سلوا نے صرف دو گریڈ تک پڑھ کر تعلیم کو خیر باد کہا اور گھر کی حالت سنوارنے گھر سے نکلا۔ ۔اس وقت اس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ کام کچھ آتا نہیں تھا۔کوچہ و بازاروں میں پھر کر لوگوں کے جوتے پالش کرنے لگا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ خود کے پاس جوتے نہیں اور ننگے پیر ہے لیکن لوگوں کے جوتے چمکا رہا ہے آخر کسی نے ترس کھا کر اسے خراد مشین کا کام سکھا دیا اور ایک تانبے کے کارخانے ۔ میں نوکری مل گئی۔ لیکن اس کے صبر کا امتحان یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ خراد مشین پر کام ۔ کے دوران اس کی انگلی زخمی ہو گئی

زخمی انگلی کا علاج کرانے کہاں کہاں نہیں گیا۔ کس ہسپتال میں نہیں پہنچا۔ ہسپتال تھے لیکن اس کے لئے نہیں۔ ڈاکٹر تھے لیکں اس کے لئے نہیں۔دوائیاں تھیں لیکن اس کے لئے نہیں۔ شاید دنیا میں کچھ بھی اس کے لئے نہیں تھا۔ اس دوران مزدور یونین نے اس سے پورا تعاون کیا اور اس کے صحیح علاج کے لئے کوشش کرتے رہے۔آخر کار مزدور یونیں کی کوششوں سے اسے علاج کی سہولت میسر

۔ آئی اور وہ صحت یاب ہوا

لولا ڈی سلوا نے مزدور انجمنوں کی جد و جہد سے کافی اثر لیا۔ اس نے بھی اس میں عملی شمولیت کا فیصلہ کیا تا کہ دوسرے مزدور اس کی طرح بے بسی کے عالم میں کسی تکلیف کا شکار نہ ہوں۔ مزدور یونین میں شامل ہو کر اس نے مزدوروں کے مسائل حل کرنے کے لئے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا وہ برازیل کی سب سے بڑی
۔ لیبر یونین اسٹیل مل لیبر یونیں کا صدر منتخب ہو گیا

سٹیل مل کی لیبر یونین میں آ کر اسے ملک کی سیاسی صورت حال سمجھنے کا موقع ملا۔ حکومت کی پالیسیوں سے آگاہی ہوئی۔ اس نے ان کی خامیوں کے تدارک کے لئے کئی دور رس نتائج کے حامل حل پیش کئے اور ان پر توجہ نہ دینے کی صورت میں آواز بھی اٹھائی۔ اس جد و جہد میں وہ گرفتار بھی ہوا اور پس دیوار زندان بھی رکھا گیا۔ لیکن وہ جو صحیح سمجھ رہا تھا اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ حکومت کے مختلف فیصلوں پر اس کے تجزیوں --اور ان فیصلوں سے مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل پر اس کی آراء کو-- دانشور حلقوں میں خوب پزیرائی ملی اور اس کی رائے کو ایک حیثیت دی جانے لگی

ان حالات میں اس نے دانشوروں اور مختلف مزدور یونینوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی اور اس کا نام ورکرز پارٹی رکھا۔ اس سیاسی جماعت نے ملک کے دستور میں ترمیم کے مطالبات اٹھائے۔ سب سے.برا مسئلہ تو یہ تھا کہ.برازیل میں صدر کا انتخاب فوج کے جنرل کرتے تھے جب کہ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ عوام کا حق ہے۔ اس کی جد و جہد رنگ لائی اور حکومت نے دستور میں انتخاب سے متعلقہ دفعات میں تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوگئے -

لیکن اس ترمیم ۔ جو اس کی جد و جہد کے نتیجے میں ہوئی تھی' کے تحت وہ انتخابات میں کھڑا ہوا تو اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد بھی مزید دو مرتبہ اور انتخابات میں ہار سے دو چار ہوا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار 2002 میں اس کی پارٹی.بر سر اقتدار آئی اور یوں اس نے جوتے پالش کرنے والے نے-- صدارت کا عہدہ سنبھالا -
اس نے قوم کے سامنے اپنا ایک نعرہ رکھا "مہنگائی عوام پر تھوپنے کی بجائے عوام پر سرمایہ کاری" - اس کے نزدیک بچوں کی تعلیم بھی عوام پر سرمایہ کاری کی ایک قسم ہے اور عوام کے قیمتی پن میں اضافہ کرتا ہے یعنی دوسرے الفاظ میں انہیں ویلیو ایڈیڈ بناتا ہے -

اقتدار میں آنے کے بعد اس نے غیر ضروری اخراجات میں کمی کے لئے کئی اقدامات کئے۔

لیبر یونین کے تجربے کی بنیاد پر اسے بخوبی علم تھا کہ سرکاری ملازمین اور پرائیویٹ اداروں میں کام کرنے والے افراد کے حالات کار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سرکاری اداروں کے اخراجات زیادہ ہیں۔ اور کام کا معیار وہ نہیں جو پرائیویٹ اداروں میں ہے۔ اسنے اس جانب خصوصی توجہ دی اور اختیارات سنبھالنے کے سات ماہ کے اندر ہی سرکاری اداروں کے ملازمین کے ضوابط پر مشتمل ایک بل پارلیمنٹ میں پیش کردیا۔ اس سے اخراجات میں کمی واقع ہوئی جو اس کے دوسرے منصوبوں میں کام آئی

غریب خاندانوں کی امداد کے لئے اس نے "خاندانی امدادی نظام متعارف کروایا۔ اس غرض سے "غریب " اور "بہت غریب " کی صحیح تصریحات یعنی "اس پے سی فیکیشن " مقرر کی گئیں۔ ان تصریحات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کروڑ کے قریب مستحق خاندانوں کو مدد پہنچائی جارہی ہے۔ان تصریحات کے سبب پیسوں کی تقسیم میں کرپشن کے امکانات کم سے کم ہیں۔ یہ امداد دو شرائط سے مربوط کی گئی۔ایک یہ کہ خاندان اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔ بچوں کی صحت کا خیال کرتے ہوئے ان کی ویکسینیشن کروائیں گے

برازیل معدنی وسائل سے مالا مال ہے لیکن کسی صحیح منصوبہ بندی نہ ہونے کے سبب
اس سے کچھ فائدہ نیں حاصل کیا جارہا تھا۔ ملک آئی ایم ایف کے قرضوں تلے دبا ہوا تھا
دنیا میں معدنی لوہے کا سب سے بڑا ذخیرہ یہاں پر واقع ہے لیکن قدرت کی یہ سب
مہربانیاں پچھلے حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کے سبب بے فیض ہو کر رہ گئی تھیں۔ لولا ڈی
سلوا نے ان معاملات پر نظر ڈالی۔ خام مال کی ترسیل کے فرسودہ ٹرک والے طریقوں
کو الوداع کہا اور متحرک پٹے یعنی کنویئر کا نظام لانے کی منصوبہ بندی کی۔ معدنیات میں
اس کی معاشی چابک دستی اور فنی رہبری سے ایک انقلاب آیا۔ اور چند ہی سال میں
خام معدنی لوہے کی پیداوار دگنی ہو گئی۔ برازیل کی وہ معدنی کمپنیاں جو دنیا میں تو کیا
خود اپنے ملک میں کسی شمار میں نہیں آتی تھیں وہ دنیا میں بڑی معدنی کمپنی کے طور پر
ابھریں۔ یہ سب کامرانیاں لوگوں کے لئے نئی نوکریوں کے دروازے بھی کھولتی جارہی
تھیں۔

زراعت میں بھی یہ ملک کسی سے پیچھے نہیں لیکن اسے بھی نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ان
کے معاملات بھی سنوارے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ملک جو آئی ایم ایف کے قرضے تلے دبا ہوا تھا اس حالت میں

آگیا کہ مقررہ مدت سے دو سال پہلے ہی سارا قرضہ بے باک کر دیا بلکہ بعد میں آئی ایم ایف کو کسی پروگرام کو چلانے کے لئے فنڈز کی ضرورت پڑی تو برازیل نے وہ رقم بطور قرضہ آئی ایم ایف کو دی -

بلاشبہ تبدیلی آچکی تھی

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے انتخابات میں عوام نے پہلے انتخابات کے مقابلے میں زیادہ ووٹ ڈالکر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور یوں وہ دوسری مرتبہ بھی صدر منتخب ہوئے - اس وقت دنیا کی دس مضبوط معاشی قوت رکھنے والے ممالک میں برازیل ساتویں نمبر پر آرہا ہے - یہ سب صرف ایک شخص کی جد و جہد فراست محنت اور سب سے بڑھ کر خلوص کا ثمر ہے - لولا ڈی سلوا پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ملک میں ذرائع نقل و حمل جسے انفرا اسٹرکچر کہتے ہیں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی - اس سلسے میں کچھ تجزیہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ملک مضبوط ہو تو یہ چیزین خود ہی در آتی ہیں انہیں کوئی روک نہیں سکتا - جب دسمبر 2010 میں لولا ڈی سلوا اپنے صدارت کے عہدے کی دوسری معیاد مکمل کرکے اقتدار چھوڑ رہے تھے تو عوام چاہتی تھی کہ وہ اگلے انتخابات میں پھر کھڑے ہوں لیکن انہوں نے نیلسن منڈیلا اور مہاتیر کے رستوں پر چلتے ہوئے مزید حصہ لینے سے انکار کر دیا اور سیاست سے بھی دست بر داری کا اعلان کیا -

جاتے جاتے ایک اور تحفہ لولا ڈی سلوا اپنے ملک کو دے گئے اور وہ ہے 2016 کے اولیمپک کھیلوں کے مقابلے ان کے ملک میں ہوں گے ۔ ان کے نزدیک یہ بھی ملک کی ترقی کے گراف کو اونچا کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ بشرط یہ کہ عوام اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس اولمپک کی پچاس سے ساٹھ لاکھ ٹکٹیں فروخت ہوں گی ۔اتنے لوگوں کی مہمان داری کے لئے جو محنت یہاں کی عوام کریں گے اس سے لوگوں کو روزگار میسر آنے کے کئی موقعے ملیں گے۔ یہ برازیل کے مختلف شہروں میں کھیلے جائیں گے ۔اس کے نتیجے میں ان تمام شہروں کے ایر پورٹ کا نظام جدید خطوط پر استوار ہوگا۔ ریلوے اسٹیشنوں کا معیار صحیح کیا جائے گا۔ سڑکیں انٹر نیشنل لیول کے معیار کے مطابق بنیں گی۔ تفریحی مراکز اپنا معیار بلند کریں گے۔ یہ سب ایک قسم کے انفرااسٹرکچر کی بہتری کی طرف ایک قدم ہوگا۔ اور یوں جو ایک شکوہ کیا جاتا ہے کہ انفرااسٹرکچر کی طرف توجہ نہیں دی اس سے وہ شکوہ کافی حد تک دور ہو جائے گا ۔

یاد رہے کہ اس مرتبہ دو نئی کھیلیں یعنی گولف اور رگبی کو بھی اولمپک گیمز کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ ایک نیا چیلنج ہے جو برازیل کو عوام نے قبول کیا ہے۔ اولپک گیمز کے لئے بے تحاشہ چیزوں کی ضرورت پڑے گی مثلاً کرسیاں . میزیں

پلنگ - یہاں تک کہ لباس لٹکانے کے لئے ہینگرز - کھانے کے لئے کٹلری یعنی چمچے - کانٹے چھریاں - - دوبئ وغیرہ مین ایسے کئ چیزین درآمد کی تھیں لیکن برازیل یہ اشیا خود بنانے کی سوچ رہا ہے تاکہ لوگوں کو روزگار مل سکے -

علم نجوم اور ستاروں سے قسمت کا حال نکانے والے کہتے ہیں کہ جن افراد کی پیدائش اکتوبر کی ہوتی ہے ان کے اندر کچھ کر دکھانے کا عزم موجزن رہتا ہے - لولا ڈی سلوا کی زندگی کے نشیب وفراز دیکھ کر لگتا ہے وہ صحیح ہی کہتے ہوں گے -

سکھر -- کیا تھی یارب -- کیا ہو گئی زندگی

بارے دنیا میں رہو ------- غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کرکے چلو یہاں --- کہ بہت یاد رہو

سکھر-- جہاں اباسین یعنی دریاؤں کے باپ دریائے سندھ سے سات نہریں نکال کر پاکستان کو دنیا کے سب سے بڑے آبی نظام کا تحفہ دیا گیا-- چار نہریں بائیں جانب اور تین نہریں دائیں جانب-

اس میں ایک نہر نارا میں اتنا پانی بہتا ہے جتنا کہ انگریزون کے اپنے ملک دریائے تھیمز میں بہتا ہے سبحان اللہ

اس نہر کی چوڑائی مصر کی شہرہ افاق نہر-- نہر سوئز سے ڈیڑھ گنا زائد ہے-- ماشااللہ

یہ نہری نظم 1931 میں انگریزی دور حکومت میں پایہ تکمیل کو پہنچا ورنہ اسے قبل یہ سارا پانی سمندر میں جا گرتا تھا-

آخری مرتبہ میں یہاں اپنے کزن تنویر حیدر اعوان کے گھر ایک شادی میں شرکت کرنے فروری 2013 کو گیا تھا-

آنکھیں بند کر کے تصور کیجئے کہ نہری نظام کی آمد سے قبل سندھ کی کیا حالت ہوگی-

ایک لق و دق علاقے کا خاکہ ذہن میں آتا ہے جہاں لوگوں نے اپنے پینے کے پانی کا انتظام کرنے کے لئے کنوئیں کھدوائے ہوئے ہیں -- گاؤں سے باہر پانی ذخیرہ کر نے کے لئے جوہڑ بنائے ہوئے ہیں جہاں سے کتے بیل بکریاں گائیں بھی پانی حا صل کر رہی ہیں اور انسان بھی اگر بارش نہیں ہو تی تو یہ جوہڑ بھی خشک ہو

جاتے ہیں اور انکی تہہ میں موجود مٹی ترخ ترخ کر انسان کی بے بسی پر آنسو بہاتی نظر آتی.

کنوؤں میں پانی کی سطح کم ہو جاتی ہے اور کنویں کا ڈول کیچڑ ملا پانی لیکر واپس آتا--

نتھار کر پانی خود رکھ لیتے اور کیچڑ ملا پانی مویشیوں کو دے دیتے-

کیا تھی زندگی

بستی گھر زمان خاموش

درخت، جھاڑ چہرے مرجھائے ہوئے

جوہڑ کنوئیں حلق سوکھے ہوئے

کھیت کھلیان ویران -- آ بجو بیابان

حکمران و عوام دونوں کنویں کے مینڈک تھے یا پھر گاؤں کے باہر واقع جوہڑ کے مینڈک-

نظریں آسمان کی جانب لگی ہوئیں کہ بادل آئیں گے بارش ہو گی اور یہ خشک سالی ختم ہو گی.

اس کے سوا ان کے پاس کوئی حل نہیں تھا

-ایسا ہی کچھ تزکرہ ضلع دادو کے جناب محمد حسین پنہور (1925--2007) کرتے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ میں جو بچپن میں دنیا کا نقشہ دیکھا کرتا تھا اس میں سندھ ایک بڑے
ریگزار کے طور پر دکھایا جاتا تھا- اور تھا بھی ایسے ہی- جب بارش سالانہ پانچ انچ ہو
اور وہ بھی ایسے کہ ہر دو ڈھائی سال بعد ناغہ کرے تو یہی حال نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا-
ہوا میں نمی کی کمی اشد محسوس ہوتی تھی- نمی کی کمی کے سبب ہم کیا جانور کیا انسان
دونوں ہی جلدی امراض کا شکار ہو جایا کرتے تھے- -یہی حال درختوں کا تھا-ایسے
درخت جو پانی کے بغیر سخت گرمی برداشت کر سکتے تھے-وہ گرمی کے وار تو سہہ لیتے تھے
لیکن اس حالت میں کہ ادھ موئی حالت میں- سال میں ایک مرتبہ ہی گرمی کے موسم
میں جب برسات ہوتی تو چاول کی فصل کاشت کر لیتے تھے اور سردیوں میں سبزیاں
-وغیرہ بو لیتے تھے- کنوؤں کا پانی بھی کوئی قابل رشک نہیں تھا
کھارا بلکہ کڑوا لیکن ہائے رے مجبوری--اسی پر صبر شکر کرکے زندگی بسر کرنی تھی سو کر
رہے تھے- بڑی ہی مشقت آزما تھی زندگی
تب سمندر پار سے کچھ عجیب بولی بولنے والے لوگ آئے- ان کا رہن سہن بھی الگ

تھا اور لباس بھی۔ اور رنگت تو تو بہت ہی حیران کن۔ لیکن وہ کئی کاموں میں ایک منفرد مہارت رکھتے تھے۔ دیو ہیکل مشینیں ان کی دسترس میں آ کر ایسی کام کرتی تھیں جیسے وہ غلام ہوں۔ انہوں نے پانی کی تقسیم کے نظام متعارف کرویا اور پانی بذریعہ انہار دور دراز علاقوں میں پہنچا اس کے سبب کاشتکاری میں اضافہ ہوا۔۔۔۔سبزہ لہلہانے لگا اور ہوا میں نمی کا تناسب بھی بڑھا۔ جلدی امراض سے بھی نجات ملی

حضرت ابو حریرہ سے روایت ہے کہ ایک بدکار عورت نے اوڑھنی سے موزہ باندھا ، کنویں سے پانی نکالا اور ایک پیاسا کتا جو وہاں زبان نکالے ہانپ رہا تھا اور اسے حسرت سے تک رہا تھا اسے پلادیا پس وہ عورت بسبب اس کام کے بخشی گئی

-وہ جو سنگسار کی حقدار تھی مغفرت سے دو چار ہوئی-

یہ بھی تو یاد آ رہا ہے کہ جو کوئی کنواں کھودے گا- - جب تک اس کنوئیں سے مخلوقات چرند پرند- - انسان اور جنات پانی پیتے رہیں گے اس سے مستفید ہوتے رہیں گے- -

-اس کا اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا

میں سوچتا ہوں کہ اس آبی نظام سے کتنے کنوؤں کا پانی مل رہا ہے اور ملتا رہے گا- حساب کتاب لگانے کی سعی کرتا ہوں تو میرا کلکولیٹر ناکام ہو جاتا ہے-- - بیشک اللہ کی ۔نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے جو وہ براہ راست بھی دیتا ہے اور کسی کے ذریعے بھی یہ آبی نظام ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انگریزوں کی وساطت سے ہمیں ودیعت کیا

-ہے

فبای آلاء ربکما تکذبان

تم اللہ کی کس کس نعمت سے انکاری ہوگے

یہ اصرار کہ بنانے والوں کو ہم سے کوئی الفت نہیں تھی بلکہ انہوں نے اپنی

منفعت کا ذریعہ بنایا میں اس پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن ایک کتاب کا لکھا ہوا فقرہ ذہن میں
کلبلانے لگتا ہے کہ اگر وہ وہ یہ فعل سرانجام نہ دیتا تو تمہیں کتنا نقصان ہوتا۔

میں ایک نہر کے کنارے بیٹھا تھا۔ اوپر درختوں کی دوسری جانب پرندے اڑ رہے تھے۔
پانی دھیمے دھیمے ہلکی آواز میں بہہ رہا تھا۔ ایک خوبصورت سی موسیقی کا جنم ہو رہا تھا۔
-- یہ خیال میرے دل مئں آیا کہ یہ موسیقی کس ساز کی مرہون منت ہے
اس سوچ کے ساتھ ہی اچانک ایسے محسوس ہوا کہ اس کانوں میں رس گھولنے والی
موسیقی کے ساتھ کچھ انسانی آوازیں بھی شامل ہو گئیں ہیں۔ - میں نے پلکیں
جھپکائیں اور کان ان نئ آوازوں کی جانب کر لئے۔ ایسے لگتا تھا کہ نہر کے خالقین کی
آوازیں ہیں۔

ساز زندگیوں کے ہم چھوڑ آئے
تمہارے شہر میں جہاں اک چھوڑ آئے
کچھ لوگ ان کے جواب میں کہہ رہے تھے

ساز زندگیوں کے تم چھوڑ گئے

ہمارے شہر میں جہاں اک چھوڑ گئے

--------------------------ساز زندگیوں کے

-------------------------- ساز زندگیوں کے

ساز زندگیوں کے

آوازیں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں اور پھر بالکل معدوم ہو گئیں۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ ایک پتھر نہر میں ڈالا اور کہا

اے نہر میری نشانی یاد رکھنا۔ میرے قدم اللہ کی تعمیل میں یہاں آئے تھے کہ اس نے کہا کہ ارد گرد کی بستیوں کو گھوم پھر دیکھو۔۔ اس کے اندر عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

کراچی کا ایک عجیب پروفیشنل ہوٹل

جب پاکستان اسٹیل مل اپنے تنصیباتی مراحل سے گزر رہا تھا تو اس وقت مجھے ایک دشوار مرحلہ پیش آیا۔

ایک قیف نما پانی کی ٹنکی جسکی بلندی سات آٹھ منزلوں کے برابر تھی اس کی بیرونی سطح پر رنگ کروانا پڑا۔ اس کے لئے کسی چھوٹے ٹھیکیدار کی ضرورت پڑی - جو کم سے کم دام میں مقامی طریقے جسے عرف عام میں "جگاڑ" کہتے ہیں لگا کر یہ کام کردے۔ مجھے اپنے کیریر کا آغاز کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

ایک دوست سے بات کی۔ اس نے کہا کوئی مسئلہ ہی نہیں -- صدر آجاؤ اور کیف جارج کے قریب ہی سامنے ایک ہوٹل ہے وہاں مجھے ملو۔ وہاں مطلوبہ کام کرنے والے مل جائیں گے اور اپنے رنگ کرنے اسکیم اور منصوبہ بندی سے بھی آگاہ کردیں گے -- بس وقت کا خیال رکھنا کہ شام کے پانچ بجے کے بعد آنا۔

میں وقت مقرہ پر متزکرہ ہو ٹل پہنچ گیا - آدھے گھنٹے ہی میں سارا ہوٹل بھر گیا -ہر نیا گاہک آتا اور چائے کا آرڈر دیتا اور ادھر ادھر نظر دوڑاتا اور کسی نہ کسی کے پاس اٹھ کر چلا جاتا یا اسے اپنی ٹیبل پر بٹھا کر مختلف انجینئرنگ کے - یا تعمیراتی مسائل پر بات چیت شروع کر د یتا - زیادہ تر افراد اپنی موٹر سائیکلوں پر آرہے تھے - تب میرے دوست نے بتایا کہ جسطرح ادیبوں نے اپنا ٹی ہاؤس بنایا ہے اسی طرح ان چھوٹے ٹھیکیداروں نے اپنے لئے یہ ٹی ہاؤس بنایا ہے -یہاں آکر اپنے مسائل پر بات چیت کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حل لیکر جاتے ہیں -

میرے دوست نے ہوٹل اور ہوٹل کے افراد کا احوال بتا کر ادہر ادہر نظر ڈالی -دو تین افراد کو آواز دی -وہ اٹھ کر آگئے - میں نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا - تھوڑی ہی دیر میں سب نے بحث کی اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کا حل پیش

کیا۔ یہ حل وہ ہوتے ہیں جو پاکستان میں مقامی افراد جدید مشینوں کی غیر دستیابی کی
۔ صورت میں اختیار کرتے ہیں

۔ میں تقریباً آٹھ بجے تک وہاں رہا اس کے بعد ہوٹل خالی ہوگیا۔ پھر عام افراد رہ گئے

اسٹیل مل سے ریٹائر ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ملازمت کے دوران کئی پیچیدہ مسائل
حل کئے۔ ان گنت انتہائی زیرک تکنیکی الجھنیں سلجھائیں۔ تعریفی خطوط بھی ملے لیکن یہ
۔ ہوٹل اور اس میں آنے والے افراد اب بھی یاد آتے ہیں

نہ جانے اب بھی یہ لوگ آتے ہیں یا وہ بھی افتادِ زمانہ کی گرد میں کھو گئے
شہر کراچی سب کے مسائل حل کرتا تھا

اداکار محمد علی مرحوم کا قصہ اور میری آپ بیتی

احمد عقیل روبی اپنی کتاب "کھرے کھوٹے" میں اداکار محمد علی کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی لاہور آمد کے بعد کس طرح ایک ٹھیکیدار نے کیسے ان کے تین روپے ہتھیا لئے تھے اور بعد میں انہوں نے کیسے نکلوائے۔

اداکار محمد علی مرحوم کے تین روپے والے قصے پر اپنے پر بیتے ایک واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میں "شاندار" نامی کوچ میں سفر کر رہا تھا۔ نام تو اس سروس کا شاندار کوچ تھا لیکن اس کے مالکان اور ڈرائیور کی حرکات میں کہیں بھی شاندار کی جھلک نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ۔۔مثلآ کبھی آدھے راستہ پر ایک خاص مقام پر جا کر روک لینا کہ اس سے آگے نہیں جائیگی اور اس طرح لوگوں کا ڈبل کرایہ دیکر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کوچ والوں کا وطیرہ تھے اور عام بات تھے۔

اصل قصہ میں جو بیان کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کنڈکٹر نے مجھ سے پانچ روپے مانگے -میں نے اسے بڑا نوٹ دیا - اس نے پیسے کچھ اس طریقے سے واپس کئے کہ ایک دس روپے کا نوٹ کٹی پتنگ کی طرح لہراتا ہوا کوچ کے دروازے سے باہر نکل گیا اور گھپ اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا - غلطی اس کنڈکٹر کی تھی لیکن وہ نہیں مانا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا -رات ہو چکی تھی اور یہ آخری کوچ تھی جو جا رہی تھی -لوگ بھی خاموش بیٹھے رہے اور کسی نے کچھ نہ کہا -مجبوراً میں بھی خاموش ہوگیا - کنڈکٹر ، ڈرائیور کے ساتھ جاکر بیٹھ گیا کیونکہ آگے دور تک کسی اور سواری کے ملنے کا امکان نہیں تھا -

میں مایوسی کے عالم میں سوختہ دل کے ساتھ باقی پیسے گننے لگا تو مجھے حیرت ہوئی - میں نے دوبارہ گنے کہ غلط تو نہیں گن رہا - میں نے نے کنڈکٹر کو پھر بلایا - اس نے پھر اسی ترش اور اکھڑ لہجے میں جواب دیا "غلطی آپ کا ھے آپ کو ہم نے بول دیا ھے- سمجھ میں نہیں آتا "

میں نے نرم لہجے میں کہا" جناب میں نے آپ کو پچاس کا نوٹ دیا تھا اور آپ نے غلطی سے سو کا نوٹ سمجھ کر اسی حساب سے پیسے واپس کئے ہیں۔ یہ پیسے واپس لے لو "

کوچ میں ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ھو یا سب مسافر حاتم طائی کی کہانیوں کی طرح پتھر کے بت بن چکے ہوں اور ان کی قوت گویائی چھن چکی ہو۔ صرف انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کنڈکٹر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔

آخر کنڈکٹر اپنی جگہ سے اٹھا اور پیسے لینے آیا۔ میں نے اسے پیسے واپس کرتے ھوئے کہا "یہ دس روپے جو باہر اتر گئے تھے میں کاٹ رہا ھوں"
وہ پیسے کاٹ کر میں نے اسے چالیس روپے واپس کئے۔ کنڈکٹر کچھ نہ بولا سناٹا اب بھی طاری تھا۔ آخر ایک مسافر سناٹے کی گرفت سے آزاد ہوا اور اس نے کہا "شکر کرو کنڈکٹر آپ سے اب اتر جانے والے پیسے طلب کرنے پر اصرار نہیں کر رہا "

میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں اسے پیسے نہیں واپس کرتا تو یہ سمجھ سکتے تھے کہ کوچ بغیر مسافروں کے آئی ھے۔ کیوں کہ مسافروں کی تعداد بہت کم تھی اور انکا کرایہ اتنا ھی بنتا تھا جو میں نے واپس کیا تھا۔

معین اختر کی چوتھی برسی ہے

مجھے وہ وقت یاد آرہا ہے جو میں نے معین اختر مرحوم کی معیت میں ایک محفل میں گزارا تھا یہ ایک عجیب محفل تھی کہاں ابھی لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور کہاں چند ہی لمحوں بعد رنج والم کی تصویر بنے بیٹھے نظر آتے تھے۔۔

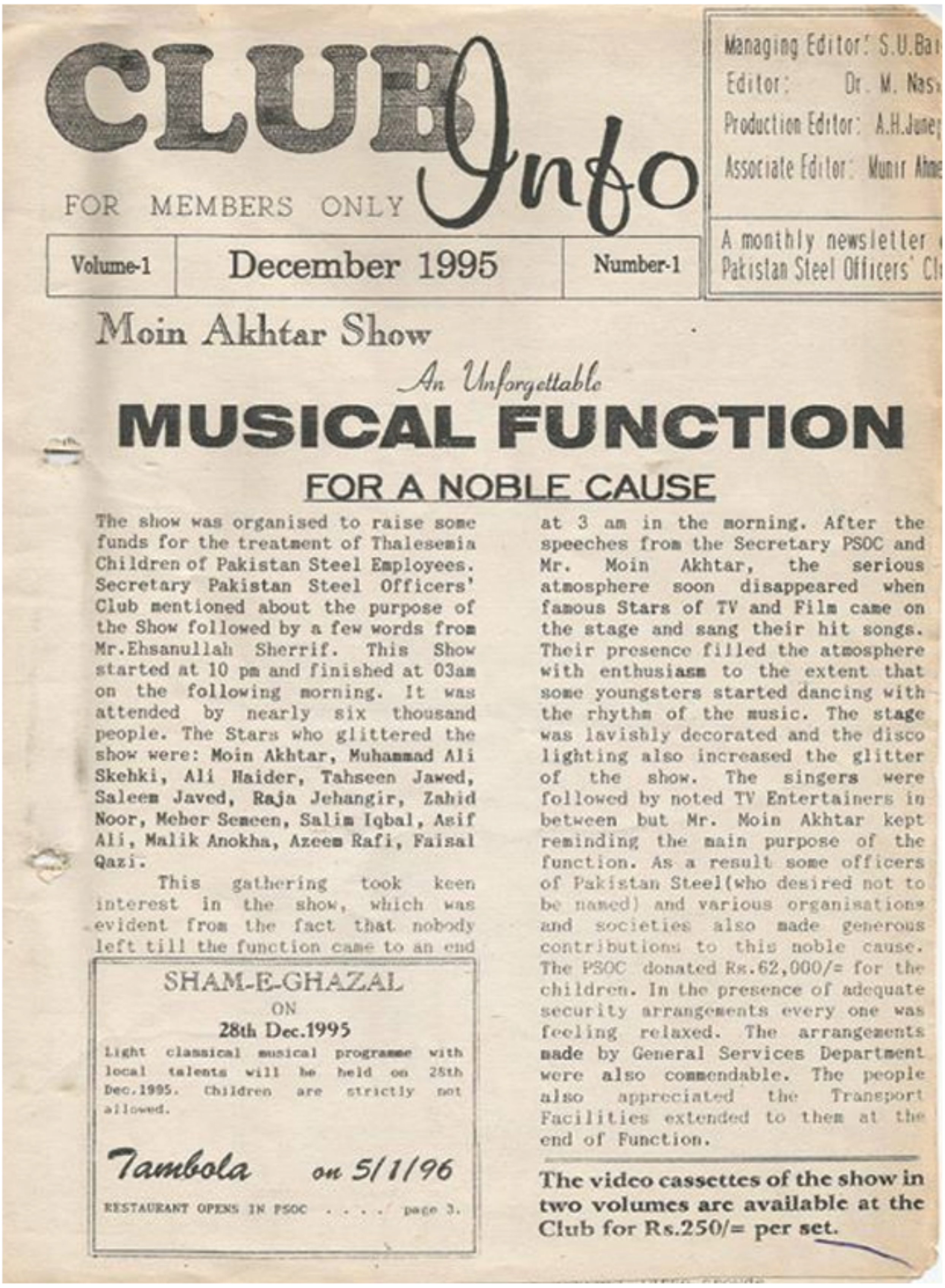

CLUB Info
FOR MEMBERS ONLY
Managing Editor: S.U.Ba
Editor: Dr. M. Nas
Production Editor: A.H.June
Associate Editor: Munir Ahme
A monthly newsletter
Pakistan Steel Officers' Cl
Volume-1 | December 1995 | Number-1

Moin Akhtar Show

An Unforgettable

MUSICAL FUNCTION

FOR A NOBLE CAUSE

The show was organised to raise some funds for the treatment of Thalesemia Children of Pakistan Steel Employees. Secretary Pakistan Steel Officers' Club mentioned about the purpose of the Show followed by a few words from Mr.Ehsanullah Sherrif. This Show started at 10 pm and finished at 03am on the following morning. It was attended by nearly six thousand people. The Stars who glittered the show were: Moin Akhtar, Muhammad Ali Skehki, Ali Haider, Tahseen Jawed, Saleem Javed, Raja Jehangir, Zahid Noor, Meber Semeen, Salim Iqbal, Asif Ali, Malik Anokha, Azeem Rafi, Faisal Qazi.

This gathering took keen interest in the show, which was evident from the fact that nobody left till the function came to an end at 3 am in the morning. After the speeches from the Secretary PSOC and Mr. Moin Akhtar, the serious atmosphere soon disappeared when famous Stars of TV and Film came on the stage and sang their hit songs. Their presence filled the atmosphere with enthusiasm to the extent that some youngsters started dancing with the rhythm of the music. The stage was lavishly decorated and the disco lighting also increased the glitter of the show. The singers were followed by noted TV Entertainers in between but Mr. Moin Akhtar kept reminding the main purpose of the function. As a result some officers of Pakistan Steel(who desired not to be named) and various organisations and societies also made generous contributions to this noble cause. The PSOC donated Rs.62,000/= for the children. In the presence of adequate security arrangements every one was feeling relaxed. The arrangements made by General Services Department were also commendable. The people also appreciated the Transport Facilities extended to them at the end of Function.

The video cassettes of the show in two volumes are available at the Club for Rs.250/= per set.

SHAM-E-GHAZAL
ON
28th Dec.1995

Light classical musical programme with local talents will be held on 28th Dec.1995. Children are strictly not allowed.

Tambola on 5/1/96

RESTAURANT OPENS IN PSOC . . . . page 3.

یہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ تو ایسے محسوس ہوتا کہ نہ یہ طرب ومزاح کی محفل ہے اور نہ ہی غم ویاس کی مجلس بلکہ یہ تو کوئی مذہبی وعظ ہو رہا ہو ایک ہی

تقریب تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف روپ بدل رہی تھی یہ سب کچھ معین اختر کا ہی کمال تھا کہ محفل کو کئی رنگ دے رہے تھے یہ پاکستان اسٹیل کے دو ملازمین کے بچوں جو کہ تھلیسیمیا کے مہلک مرض کا شکار تھے کے لئے چندہ جمع کرنے کی تقریب تھی۔ اور اسے پاکستان اسٹیل آفیسرز کلب کی طرف سے منعقد کیا جا رہا تھا اس سے قبل ۔ احسان اللہ شریف نے اپنے مختصر خطاب میں معین اختر کا استقبال کیا

میں پاکستان اسٹیل آفیسرز کلب کے نیوز لیٹر " کلب انفو " کے ایسو سی ایٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اس تقریب کا حال لکھنے کے لئے موجود تھا جب معین اختر نے اس بیماری کے بارے میں تفصیل بتائی تو ایسے لگا کہ کسی ماہر ڈاکٹر کا مقالہ سن رہے ہوں جب وہ مریض بچوں کا حال زار بتا کر مذہبی فلسفے کی روشنی میں ایسے افراد کی مدد کرنے کے بارے میں کہہ رہے تھے تو ایسے لگتا تھا کہ ایک تقدس بھرے ماحول میں ہم سب سانس لے رہے ہیں - - جہاں ہم ہیں - - وہ بچے ہیں اور سامنے معین اختر ان بچوں کی مدد کے سوالی بنے کھڑے ہیں درد کی آواز لہر بن کر ان کے دل سے نکلتی اور سامعین کے دل میں ہلچل مچاتی محسوس ہوتی تھی ان کے کئی فنکشن دیکھے ہیں لیکن پاکستان اسٹیل کا یہ فنکشن اس لئے یادگار بن کر دل میں سمایا ہوا ہے کہ یہاں پر انکے کئی روپ کئی انداز کئی رنگ ایک ساتھ جلوہ گر تھے کل وہ دو بچوں کے لئے ہمارے سامنے سوالی بنے کھڑے

تھے اور آج اللہ کے حضور میں ان کے لئے رحمتوں کا سوالی بن کے کھڑا ہوں اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کے درجات
-بلند فرمائے اور ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرتا رہے
آمین -یارب العالمین
جمیل الدین عالی نے ایک مرتبہ کہا کہ ٹی وی ، فلم یا اسٹیج کے اداکار (ستارے) ان کے موضوعات میں شامل نہیں لیکن حیرت ہوئی کہ اس کے باوجود وہ معین اختر کی ایک بات سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے قریباً22
- سال قبل ایک پورا کالم 30 اکتوبر1992 معین اختر صاحب کی کسی بات سے متاثر ہو کر لکھا
" اپنے کالم کا عنوان بھی مرحوم کے نام پر رکھا " معین اختر کا پیام -کام --نام--کام

اپنے اس کالم میں جمیل الدین عالی صاحب کہتے ہیں کہ "معین اختر کا ایک قول دل پر نقش ہو گیا ہے اور چاہتا ہوں کہ اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان ان قارئین تک پہنچاؤں جو کسی نہ کسی طریقے سے عملی زندگی گزار رہے ہیں -اور بطور خاص جن کی زندگی میں کارگردگی کوئی اہمیت رکھتی ہے-

جمیل ا لدین عالی کہتے ہیں-" قارئین جانتے ہیں کہ میں قدیم و جدید مفکرین ہی نہیں بلکہ ایسے افراد کے اقوال بھی نقل کر دیا کرتا ہوں جنہیں میری فہم کے مطابق عام آدمی کے علم میں آجانا چاہئے - "

عالی آگے مزید لکھتے ہیں کہ " معین اختر صاحب نے ایک ٹی وی-- این ٹی ایم کے پروگرام میں کچھ یوں کہا ---جناب دیکھئے مجھے اس پیشے میں آئے ستائیس برس ہو گئے ہیں -- کئی مرحلوں سے گزرا --معین صاحب نے مرحلے بھی بتائے - اور اس کے بعد معین اختر نے ایک نتیجہ نکالا --پہلے تو کام کی کھاتے ہیں -یعنی بہت

کام کرنا پڑتا ہے تب شہرت اور کمائی بنتی ہے۔ ۔پھر کچھ عرصہ نام کی بھی کھا سکتے ہیں۔ کہ مشہور تو ہو ہی گئے۔۔ نام چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ساری عمر نام کی نہیں کھا سکتے۔ ۔نام کی کھانے کے بعد اگر کچھ مطلوب ہے یا شہرت.برقرار رکھنی ہے تو پھر کام کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد جمیل الدین عالی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " یہ بات میں نے کسی قدر پھیلا کر یا قدرے آسان لفظوں دہرائی ہے۔اس لئے کہ آج کل کوئی بھی شعبہ حیات ہو۔۔۔۔۔۔ ان میں ہمارے مشاہیر صرف نام کی کھائے چلے جا رہے ہیں ۔ کام کی نئی آزمائشوں میں نہیں جاتے۔۔یقیناً یہ انکا جمہوری حق ہے لیکن یہ حق نہیں کہ دوسرے کام کرنے والوں کی جگہ پر صرف اپنے نام کی وجہ سے قبضہ جمائے رکھیں۔"
جمیل الدین عالی نے کالم میں جو بات کہی ہے اس پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مکالمہ ہونا چاہیے ۔

وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے کامیابی دی

میں نے 1974 میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے مکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔
اور پاکستان اسٹیل مل میں شمولیت اختیار کی۔
اس زمانے میں اسٹیل مل کی تعمیر کا آغاز ہوا ہی تھا۔ جون جولائی کا مہینہ تھا۔ مجھے لق و دق میدان میں سخت گرمی میں پائپ بچھانے کا کام سونپا گیا۔ طرح طرح کے حشرات الارض سانپ بچھو اور سانڈے پھرتے نظر آتے تھے اور اوپر آگ برساتا سورج ہوتا تھا۔

© Can Stock Photo - csp14827645

- " ہمارے چیف انجینئر نے تعیناتی لیٹر پر سائن کرتے ہوئے کہا "کام سنبھال لوگے نہ
"میں نے جواب دیا "جی ہاں
خیر یہ تپتی دھوپ اور سانپوں کے معاملات تو ایک طرف ایک دوسرا مسئلہ جس سے میں
دو چار ہوا وہ یہ تھا کہ اس کام کی نوعیت یہ تھی کہ زمین کا سروے کرنا پڑتا تھا کہ اس کا
لیول کیا ہے۔ اس کی ڈھلان کس طرف ہے۔ پائپ لائن کے لئے کتنا کھودنا پڑے گا۔
وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لئے مختلف کیمرہ نما مشینیں استعمال کی جاتی تھیں جیسا کہ آپ نے
- بھی کسی پل یا بلڈنگ کی تعمیر کے دوران دیکھی ہونگی
تب مجھے انکشاف ہوا کہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں تو یہ مضمون مکینیکل انجینئر کو
- پڑھایا ہی نہیں گیا تھا البتہ این ای ڈی کراچی میں پڑھایا جاتا تھا
خیر میں این ای ڈی یونیورسٹی گیا اور لائبریرین سے ملا۔ اپنے سارے مسئلے کی تشریح کی
-اور بتایا کہ ہمیں یہ مضمون لاہور میں نہیں پڑھایا جاتا تھا

لائبریرین صاحب چند لمحے مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے بیان کی تصدیق کر رہے ہوں اس کے بعد اٹھے اور ایک شیلف سے "لینڈ سروے" کی کتاب نکال کر پکڑا دی -

اس سے بنیادی اصولوں سے آگاہی حاصل کی اور پائپ بچھانے کا کام شروع کیا -

بعد میں اس کام میں اتنی مہارت حاصل ہوئی کہ مجھے ایک دوسرے پلانٹ پر اضافی طور چیف سروے انجینئر کے فرائض سونپ دئے گئے -

اب میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے کامیابی دی تو میرا تجزیہ یہ ہوتا ہے کہ اعتماد اور پھر مطالعہ - میں اس نئے کام سے ڈرا نہیں تھا اور مطالعہ کے ذریعے اپنی خامی دور کر لی تھی-

یہ سب منتظر ہیں

بیس تیس سال پہلے ایم بی اے کی تعلیم کا نام بہت ہی کم لوگوں نے سنا تھا۔ اس زمانے میں باٹنی (علم نباتات) زولوجی (علم حیوانات) وغیرہ ہی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے ماموں نے جو علم حیوانات سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ کچھ علاقوں میں بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اچھے خاصے ہرے بھرے درخت مرجھانا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان کے پتے پیلے ہو کر جھڑنے لگ جاتے ہیں۔اور آخر میں درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ اس حالت کو degeneration کہتے ہیں۔ ماموں جی نے بتایا کہ اگر ان حالات کو صحیح کر دیا جائے۔ درختوں پر توجہ دی جائے۔کھاد میں خاص اقسام کی دوائیاں ڈال دی جائیں تو درخت پھر سے ماضی کی طرح تندرست و توانا ہو جاتے ہیں۔ ان کی رعنائیاں لوٹ آتی ہیں۔

ماموں جی نے کہا کہ اسی طرح ہماری دنیا میں کئی خاندان جو خوشحال ہوتے ہیں بعض اوقات کسی مسئلے کے سبب انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھر کے صحن میں جہاں خوش حالی سے مسکراتے ہوئے چہرے نظر آتے تھے مایوسی والم کی پرچھائیاں

دکھائی دیتی ہیں۔

اپنے ارد گرد سوسائٹی پر نظر ڈالیں۔ ایسے خاندان ہیں۔

ایک خاندان کا سربرہ اچانک اس دنیا سے رخصت ہو کر خالق حقیقی سے جا ملا ہو اور

تنخواہ نہ ہونے کے سبب اچانک معاشی خلاء پیدا ہو گیا ہو جسے فوری طور پر پار کرنا

لواحقین کے بس میں نہ ہو یا فوتگی کے بعد واجبات کی ادائیگی میں تاخیر ہو رہی ہو اور

پیچھے رہ جانے والے مشکلات کے دلدل میں پھنس گئے ہوں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خاندانی تنازع کے نتیجے میں خاندان کے مختلف ممبر الگ ہو گئے ہوں

اور کوئی ایک ممبر اوراسکے دیگر ساتھی مسائل کی گردش میں آ گئے ہوں۔

یا کوئی فرد لمبی بیماری کا شکار ہو چکا ہو اور گھر والوں کی ساری جمع پونجی اس کے علاج پر

خرچ ہو رہی ہو۔

یا کسی خاندان کے سربراہ کو کسی سبب سے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے ہوں۔

-- ڈھونڈیں ایسے خاندانوں کو ڈھونڈیں

- محلے میں دیکھیں

- رشتہ داروں سے معلوم کریں

-اکاونٹنٹ جنرل کے دفتر میں جہاں پینشن کے معاملات حل ہوتے ہوں جاکر جائزہ لیں

- ان کی مدد کریں

انہیں انحطاط پذیری سے نکالیں اور دوبارہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ سجائیں

From degeneration

To regeneration

سامنے تصویر یہی کچھ بتارہی ہے -

اوپر درختوں اور خاندانوں کی انحطاط پذیری عیاں ہے - خاندان دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے - ہسپتال میں کسی کی وفات کا منظر اور اس کے لواحقین کا حال زار-

نیچے وہی درخت مناسب دیکھ بھال سے دوبارہ ہرا بھرا ہو گیا ہے اور اس کا حسن لوٹ آیا ہے - خاندانوں کی مدد کرنے سے ان کے چہروں پر مسکراہٹ کے پھول کھل رہے ہیں -اسکول میں بچے سکون سے پڑھ رہے ہیں-

آئیے --قدم بڑھائیے - یہ سب منتظر ہیں

ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کا ایک غازی

کچھ شخصیتیں ہوتی ہی جن کا خمیر کلیتاً محبت اور اخلاق سے تعمیر ہوتا ہے۔ جو کامیابیوں اور تشنہ کامیوں سے قطع نظر دوسروں کے لئے چراغ روشن کر جاتے ہیں جن کی ضیاء میں آنے والی نسلوں کو اپنی کامیابی کامرانی اور خوشحالی کی راہیں متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی

مرحوم لیفٹیننٹ کرنل نظام الدین انہی میں سے ایک تھے۔

مجھے اپنے بڑوں کی طرف سے نصیحت تھی جب ایسی شخصیت نظر آئے تو تم ہاتھ باندھ لیا کرنا اور نظریں نیچے کر لیا کرنا۔۔

ان کو دیکھتے ہی خود بخود یہ حرکتیں مجھ سے سرزد ہو جاتیں۔

لفٹنٹ کرنل نظام الدین ---1965 کی جنگ میں کشمیر کے محاذ پر تھے - کشمیر کی حسین اور دلفریب وادیوں میں ایک عجیب سماں طاری تھا - توپوں کی گھن گرج ، بندوقوں کی تڑا تڑ ،آسماں چیلوں کی طرح اڑتے طیاروں کی ہولناک آوازوں سے پوری وادی گونج رہی تھی - دشمن فوجیں بھی اپنا پورا زور لگارہی تھیں - دونوں طرف تناؤ کا عالم تھا -- دشمن کو روکنے کا ایک ہی حل تھا کہ پاکستان کےان مورچوں کو جو کسی لاجسٹک (اسلحہ، اشیائےخورد و نوش، افرادی قوت) کے لحاظ سے یا کسی اور لحاظ سے کم زور ہوں مضبوط کیا جائے -

اس کوشش میں میں جان جانے کا خدشہ تھا لیکن کرنل نظام الدین نے اس کی تکمیل کے لئے پورا زور لگا دیا - ادہر دشمن کو بھی اندازہ تھا کہ کون سے مورچوں سے کم جواب آرہا ہے - دشمن کی کوشش تھی کہ یہ مورچے توانا نہ ہونے پائیں - دشمن نے تڑا تڑ فائرنگ شروع کردی - لیکن کرنل نظام الدین نے اسکی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا مشن جاری رکھا - - مورچوں کے مسائل حل ہوئے - -اس دوران دشمن کی ایک گولی انہیں بھی لگی -

اب پاکستانی جانب سے اینٹ کا جواب پتھر سے ملنے لگا۔ اور اس کے بعد دشمن کو یہاں حملے کی جراءت نہ ہوئی دشمن کی گولی کے سبب پیر میں جو نقص پیدا ہوا۔۔ یہ نقص ساری حیات ان کے ساتھ رہا اور پاکستانیوں کو یاد دلاتا رہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا آج تمہارے کل کے لئے قربان کردیا

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آمین۔۔ یارب العالمین

انتہا پسند ہندوؤں نے تقریب رکوانے کے لئے منتظم کے چہرے پر کالک مل دی

بھارت میں پاکستان کے سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی کتاب کی افتتاح کے موقع پر بھارتی انتہا پسندوں نے تقریب کے ایک منتظم سدھیندر کل کارانی کا چہرے پر کالک مل دی۔ اس کے باوجود سدھیندر کل کارانی نے تقریب منعقد کروائی۔

اخبار " گارڈین " کے مطابق ان ساری حرکات کے پیچھے بھارت میں گائے کا گوشت کھانے پر پابندی اور اس سلسلے میں بقول انتہا پسندوں کے کچھ مسلمانوں کی خلاف ورزی کے محرکات ہیں۔ ابھی کچھ دنوں قبل دیلی کے مضافات میں ایک مسلمان اس لئے قتل کر دیا گیا تھا کہ وہ بقول انتہا پسند ہندوؤں کے گھر میں گائے کا گوشت کھا رہا تھا۔ یاد رہے کہ بھارت میں گائے کو ایک تقدس کا درجہ حاصل ہے۔

جو ادارہ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ کی کتاب کا افتتاح کرنے جا رہا تھا اسے بھی اس سلسلے میں پہلے ہی اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں ایک مشتعل ہجوم نے فنکشن کے ایک ممبر سدھین کل کارانی کو

گاڑی یں سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور چہرے پر سیاہی مل دی۔ احتجاج کرنے والوں کا تعلق ایک چھوٹی سی سیاسی جماعت سے ہے جو کسی صوبے میں موجودہ برسراقتدار پارٹی کی اتحادی جماعت ہے۔

دریں اثنا بھارت کے اکیڈمی اف لیٹر کے کچھ ادیبوں نے اس قسم کی پھیلی ہوئی فضاء کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے انعامات واپس کردئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس قسم کے کسی بغیر عدالی کاروائی کے قتل ملک کا سکون درہم برہم کردیں گے۔ انعامت واپس کرنے والوں میں سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی بھانجی بھی شامل ہے۔

یہاں امر قابل ذکر ہے کہ بھارت کے علاقے ناگاوں میں رہنے والے قبائل گوشت کا استعمال کرتے ہیں بلکہ اپنے ایک دیوتا کے چرنوں میں ہر سال ایک گائے کی قربانی کرتے ہیں۔ ماضی میں یہاں آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور اب بھی اس کے آثار باقی ہیں۔ بھارتی رسالے "الرسالہ" اگست ۱۹۹۷ کے مطابق دہلی سے کچھ ھندو صحافی یہاں کے حالات کا جائزہ لینے اور کشیدگی کم کروانے کے لئے پہنچے تو انہوں نے گوشت کھانا شروع کردیا تھا کہ ان قبائل میں آرام سے گھل مل سکیں۔ ایک صحافی کا کہنا تھا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ گوشت کھایا تو ایسا لگا جیسے ربڑ چبا رہا ہوں۔ ۱۹۹۶ میں وہاں کے ایک آزادی پسند قبیلے کے

رہنما کا انٹرویو ویکلی کلکتہ ۱۶۔۔ ۲۲۔۔ جون میں چھپا تھا جس میں اس نے ہندوؤں کے دیوتاؤں راما اور کرشنا کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ یہ قابل مسلمان نہیں ہیں۔

کیا یہ انکشافات کی محفل تھی ؟

جی ہاں ! یہ انکشافات کی محفل تھی

ہر لمحہ ایک نیا انکشاف ۔

ہر لحظہ ایک نئی بات آشکارا

اور ہم تھے کہ انگشت بدنداں سنے جارہے ۔

یہ معلوم ہوا کہ اونٹ اور انٹرنیٹ دو مختلف عادات کے مالک ہیں

یہ بھی پتہ چلا کہ کسی ایک ادارے میں اکٹھے پندرہ ہزار ادیب و دانشور نظر نہیں آتے

اور یہاں ہماری ویب سے پندرہ ہزار ادیبوں و دانشوروں کا تعلق ہے

یہ سن کر بھی اچنبھا ہوا کہ ہماری اس محفل میں آمد سے لیکر اس وقت تک آدھے گھنٹے

کے دوران تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد دنیا بھر میں "ہماری ویب " سے مستفید ہو چکے ہیں

حیرت اس وقت بھی ہوئی جب کسی نے بتایا کہ لوگ پرنٹ میڈیا پر لکھنا فخر سمجھتے تھے

لیکن وقت نے انگڑائی لی ہے اور اب الیکٹرانک میڈیا لوگوں کی توجہ کھینچ رہا ہے

اور یہ عجب تماشہ بھی دیکھا کہ محفل میں ایک سامع کے بھانجے کا دوست جو امریکہ کا ویزہ رکھتا تھا ایک ادیب سے بار بار معذرت کر رہا تھا کہ اپنے مضامین کا پرنٹ آؤٹ نہ دیں بلکہ ویب سائٹ بتائیں

ہم یہ دیکھتے جا رہے تھے اور خلاء میں نظریں جمائے سوچ رہے تھے کہ کہ اگلے زمانے میں یہ حاتم طائی جو ہوا کرتا تھا وہ دیس دیس جا کر زیادہ حیران ہوا کرتا تھا یا ہم یہاں زیادہ حیران ہو رہے ہیں

خلاء میں اس لئے گھور رہے تھے کہ پرانے دور کے کئی ناولوں میں پڑھا ہے کہ نازک) اندام ہیروئن یا خوبرو ہیرو سوچوں کے دوران ایسا کیا کرتے تھے (

صاحبو یہ ہفتے کے دن کا قصہ ہے۔ کراچی میں گرمی کراچی کے باسیوں کو الوداع کہہ رہی تھی اور سردی کی آمد آمد تھی جبکہ نوجوان نسل کا کہنا یہ ہے کہ موسم سرد نہیں ہوا ہے بلکہ خوشگوار ہوا ہے سردی ابھی دور ہے۔ خیر اسی خوشگوار موسم میں ہماری ویب نے ایک مقامی ہوٹل میں مشہور شاعر اور ادیب جناب سحر انصاری کو حکومت پاکستان کی طرف سے "ستارہ امتیاز" ملنے کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انیس نئی برقیاتی کتب جنہیں عرف عام میں ای بکس کہا جاتا ہے کی رونمائی بھی ہو رہی تھی ۔

جناب سحر انصاری صاحب کی زندگی نوجوان نسل کے لئے ایک مشعل راہ کا کام دیتی ہے اور ان سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ اس تقریب میں وہ وقت مقررہ پر تشریف لائے جبکہ ہم جیسے لوگ جن کی دوسری کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی اپنے روائتی سستی کے سبب کچھ تاخیر سے پہنچے۔

تقریب کا آغاز تلاوت سے ہوا۔ تلاوت کا اعزاز ہماری ویب کے ایک کالم نگار جناب ڈاکٹر شیخ ولی خان المظفر کو ملا۔ ۔ ان کی اواز میں بے ساختگی تھی۔ بناوٹ سے دور کانوں میں رس گھولتے ہوئے الفاظ کا اتار چڑھاؤ کمال درجے کو پہنچا ہوا تھا۔ ایسے محسوس ہوا کہ فضاء میں پھیلی ہوئی کثافتیں دھل گئی ہیں اور ایک بھاری پن جو پھیلا ہوا تھا غائب ہو گیا اور ہر سو ایک نرماہٹ سی پھیل گئی۔

ہماری ویب رائٹر کلب کے چیئر مین اور ہماری ویب کے بانی جناب ابرار احمد صاحب نے مہمان گرامی جناب سحر انصاری کے اعزاز میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔

جناب ابرار صاحب، چیر مین و بانی ہماری ویب کی باتیں سن کر احساس ہوا کہ

اردو کے یہ شیدائی تو مسلسل امتحان میں ہیں۔ انکا کہنا تھا کہ انٹرنیٹ کی دنیا کبھی ایک
کروٹ نہیں بیٹھتی۔ بعد میں کھانے کے دوران میں ہمارے ایک نٹ کھٹ ساتھی نے
- لقمہ دیا کہ جی ہاں جناب یہی فرق ہے

اونٹ اور انٹرنیٹ میں۔ اونٹ ایک کروٹ بیٹھ گیا تو پھر ویسے ہی بیٹھا خاموشی سے
جگالی کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے جبکہ انٹرنیٹ کا جہاں ہمیشہ تغیر و تبدل کے
عمل میں رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے استعمال کرنے والے کو بھی مستعد رہنا
پڑتا ہے۔ آفرین و تحسین ہے ابرار صاحب کے لئے کہ نئے چیلنجوں سے بخوبی نبرد آزما
- رہتے ہیں

ابرار صاحب بتا رہے تھے کہ جب ہماری ویب کا آغاز ہوا تو اسے میز پر رکھے کمپیوٹر کے
لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ لیکن جب انٹرنیٹ نے موبائل ٹیلی فون پر اپنے جلوے دکھانے
شروع کئے تو ہمیں بھی اپنی ہیئت اور بنت میں تبدیلی کرنی پڑی۔ انگریزی زبان کو یہ
مسئلے نہیں پیش آئے لیکن اردو کی راہ میں طرح طرح کی دشواریاں آئیں۔ داد دینی
- چاہئے ہماری ویب کے عملے کو کہ یہ سب رکاوٹیں احسن طریقے سے دور کیں

ابرار صاحب کی ایک بات سن کر تو ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا "شیطان کے کان

بہرے ۔ دشمنوں کے منہ میں خاک " اور ہمارے ساتھ بیٹھے ادیب کے کان کھڑے ہو گئے ۔ اسرار صاحب رہے تھے کہ ہماری ویب کو سالانہ دو کروڑ اڑتالیس لاکھ افراد دیکھتے ہیں ۔ ہم ٹھہرے حساب کتاب کے آدمی ۔ فوراً حساب کتاب لگایا کہ تقریب شروع ہوئے تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا ہے اور اس دوران ڈیڑھ ہزار افراد ہماری ویب دیکھ چکے ہیں ۔ ہمارے سامنے تو کئی مناظر بھی آ گئے ۔ بس اڈے کے ۔ ریلوے اسٹیشن کے ۔ ہوائی اڈے کے ۔ ریل گاڑی کے اندر سفر کرتے ہوئے مسافروں کے ۔ سرسبز کھیتوں میں درخت کے نیچے ستاتے ہوئے دھقانوں کے ۔ کسی دفتر کے باہر افسر سے ملاقات کرنے کے منتظر ضرورت مندوں کے ۔ ہسپتال میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے افراد کے اور نہ جانے کیا کیا ۔ یہ سب افراد اکتاہٹ کی یہ ساعتیں گزارنے کے لئے اپنے اپنے موبائیل پر ہماری ویب سے استفادہ کرتے نظر آئے ۔ یہ خیال بھی کیا چیز ہے کہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کہاں کہاں پہنچا دیتا ہے ۔ ہم نے ہم سر جھٹک کر اپنے کو ان خیالات سے آزاد کیا اور اسرار صاحب کو سننے لگے ۔

اسرار صاحب کی اگلی بات ہمیں اسٹیل مل لے گئی ۔ ایک زمانہ تھا کہ اسٹیل ٹاون اور اسٹیل مل میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ طارق عزیز صاحب نے نیلام گھر میں سوال کیا کہ وہ کون سی آبادی ہے جہاں سب سے زیادہ انجینیئر رہائش رکھتے ہیں ۔ جواب دینے والے نے اسٹیل ٹاؤن کراچی کا حوالہ دے کر انعام حاصل کیا ۔

ہر قسم کے انجینیئر -- معدنیات کے انجینیئر - علم کیمیا کے انجینئر - دھات کاری کے انجینئر میکانیکل معاملات سے نبٹنے والے انجینئر - بجلی و برق سے نبرد آزما انجینئر - اونچی - اونچی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارات کے انجینئر - ہر پتھر کے نیچے انجینئر - ہر پتھر کے اوپر انجینئر - دائیں انجینئر - بائیں انجینئر - یہ بات لوگوں نے اڑائی تھی یا واقعی ایسا سوال کیا گیا تھا اس سے قطع نظر اسرار صاحب کی یہ بات تو دل کو لگتی ہے کہ کسی ایک ادارے میں پندرہ ہزار ادیب نظر نہیں آتے جو کہ ہماری ویب میں موجود ہیں - ایک - لاکھ دس ہزار کے قریب مضامیں اس نیٹ پر موجود ہیں - چشم بد دور

اس اعلان سے بھی دل کو ڈھارس پہنچی کہ جناب سحر انصاری صاحب نے ہماری ویب کے رائٹر کلب کا سرپرست اعلیٰ بننے کی درخواست قبول کر لی ہے - ان کی رہنمائی میں - تحریر نگاروں کی تخلیقات میں مزید نکھار پیدا ہو گا

یہ انٹرنیٹ ، یہ اسمارٹ موبائیل ٹیلی فون ، یہ ٹیبلیٹ -- سب نئے زمانے کی دریافتیں ہیں - پرانی نسل اس سے آشنا نہیں تھی - وحید مراد کو علم نہیں تھا کہ موبائیل ٹیلی فون کس چڑیا کا نام ہے - ذوالفقار علی بھٹو اسے نہیں استعمال کر سکے - اسرار صاحب کے بعد جب ہمارے محترم استاد پروفیسر سحر انصاری خطاب کرنے آئے تو ایسا لگتا تھا انہیں اس نئی ایجاد کے سب مسائل کا

ادراک ہے۔ انہوں نے ابرار صاحب کی جد و جہد کی تعریف کی اور کہا کہ ابرار احمد جیسے نوجوانوں کو دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے ستارہ امتیاز کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

تقریب میں انیس نئی برقیاتی کتب (ای بکس) کی رونمائی بھی کی گئی۔ اس طرح ہماری ویب نے اب تک چونتیس کتب جاری کی ہیں۔ ان کتب کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ ان ادیبوں کو پاکستان کے مسائل سے خوب آگاہی ہے۔ سلگتے سماجی مسائل، سیاسی شعبدہ بازیاں۔ طبّی حقائق۔ مذہبی امور۔ سیر و سیاحت۔ جرم و سزا کی سنگین داستانیں۔ تاریخی عمارتوں کے پس منظر۔ خوبصورت مقامات کے تذکرے۔ پس منظر میں رہ کر ملک کا نام روشن کرنے والے افراد کے بارے میں معلومات۔ غرض پاکستان کے ہر فرد کی دلچسپی کے موضوع ان کتابوں میں موجود ہیں۔

تقریب کے بعد طعام کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ پہلے ادیب پرنٹ میڈیا پر چھپنا اعزاز سمجھتے تھے لیکن اب زمانہ تبدیل ہو رہا ہے۔ اب پرنٹ میڈیا کی بجائے الیکٹرانک میڈیا لوگوں کی توجہ کھینچ رہا ہے۔ایک ادیب نے تین ای میل دکھائیں جس میں کسی اخبار کے ایڈیٹر نے اس ادیب کے الیکٹرانک میڈیا پر موجود مضامیں کو اپنے پرنٹ میڈیا پر چھاپنے کی اجازت

- مانگی تھی

ایک اور عجیب تماشہ بھی دیکھا۔ ایک صاحب کو لینے کے لئے ان کا بھانجہ گاڑی لیکر آیا تھا بھانجے کے ہمراہ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ یہ دوست اامریکی گرین کارڈ ہولڈر تھا۔۔ ابھی کھانا ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ وہ دوست مختلف ادیبوں سے باتیں کرتا رہا۔ ایک ادیب نے اپنے کچھ مضامیں کا تزکرہ کیا تو اسے بہت اشتیاق ہوا کہ انہیں پڑھے۔ ادیب بھائی نے اسے اس کے پرنٹ آوٹ دئے تو لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ کاغذ پر اردو پڑھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ اسے اس مضموں کا ویب سائٹ ایڈریس بتایا جائے۔ اپنا سمارٹ موبائیل نکالا اور ویب سائٹ ایڈریس نوٹ کرتا رہا۔ ادیب نے دو بار بلکہ تین بار پرنٹ آوٹ کی پیش کش کی لیکن ہر مرتبہ اس نے انکار کیا

-صاحبو اس پہلو پر بھی غور کرلو دنیا کہاں جا رہی ہے -

ڈرامہ نگار - خواجہ معین الدین - ۹ نومبر - ان کی برسی کا دن

مجھے اخبار کے ایڈیٹر نے فون کیا کہ نو نومبر آ گئی ہے -- مشہور ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین کی برسی کا دن -
لیکن ایڈیٹر کے لہجے میں ہکلاہٹ کیوں تھی - آواز کیوں گھبراہٹ کا شکار تھی - وہ تو صرف یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ خواجہ معین الدین کی برسی کا دن آ رہا ہے- نو نومبر کو- آپ کچھ لکھ دیجئے
انہیں پتہ ہے کہ میں کہوں گا مجھے اصل تاریخ بتاو جب اس عظیم ڈرامہ نگار کو اس دنیا نے مار دیا تھا- اس کے بعد تو وہ محض اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے -
لیکن آج نہ جانے کیوں میں خاموش ہو گیا اور لیپ ٹاپ کھول کر خواجہ معین الدین کے بارے میں جو معلوم تھا ٹائپ کرنا شروع کر دیا- حوالے کے لئے ایک دو کتب چند رسائل بھی نکال کر سامنے رکھ لئے -

رات کے دس بجے ہیں- یہ وقت سامنے والے دفتر کے چوکیدار کی واپسی بھی ہوتا ہے- وہ ہر روز اسی وقت اپنی نوکری پوری کرکے گھر جاتا ہے-اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کتا بھی ہوتا ہے- نہ جانے کتے نے کیوں اس سے دوستی کر لی ہے- خیر یہ چوکیدار ہلکے سروں میں گانا ہوئے میری کھڑکی کے سامنے سے روز گزرتا ہے- میں اپنی مصروفیات ترک کرکے اس کا گانا ضرور سنتا ہوں- سو آج بھی ایسا ہی ہوا- وہ گانا گاتے ہوئے گزرا- لیکن آج نہ جانے کیوں اس کی اواز میں زیادہ ہی سوز تھا- اس کی آواز دور ہوتی چلی گئی

میرے گیت سنے دنیا نے مگر میرا درد نہ کوئی جان سکا---نہ جان سکا

اس کا گانا پہلے کبھی بھی میرے کام میں مخل نہیں ہوا تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اس کے گانے کے سبب میرے جمع شدہ خیالات ہوا میں اڑ گئے- الفاظ جو ذہن میں تھے غائب ہو گئے- کیا لکھوں- سوچنے لگا- خیال آیا کہ کل اسے منع کردوں گا کہ یہاں گانے گاتے نہ گزرا کرو- انہی خیلات کے ساتھ ٹائپ بھی کرتا جارہا تھا کہ وقت کم تھا- - چنانچہ تحریر مین کچھ جھول ہے تو برداشت کر لیجئے

خواجہ معین الدین جن کے ڈراموں "مرزا غالب بندر روڈپر" اور "تعلیم بالغاں

لال قلعہ سے لالو کھیت تک " نے ایک زمانے میں دھوم مچائی ہوئی تھی بچپن سے ہی " اداکاری کی طرف راغب تھے - وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی اسکول ماسٹروں کا روپ دھار کر اپنے تعلیمی نظام کی خامیاں بتانے کی کوشش کرتے تھے - یہی چیز بعد میں - ان کے مشہور ڈرامے "تعلیم بالغاں " کے وجود میں آنے کا سبب بنی

انہوں نے اپنے ڈراموں میں جس طریقے سے قوم کی حالت کی تصویر کھینچی ہے میرا خیال ہے اس سے زیادہ کامیابی سے اور کوئی نہیں کھینچ سکا

علامہ اقبال کا شعر ہم سب کی توجہ کھینچ لیتا ہے اور سب ایک انجانے سے اسلامی عروج ثانیہ کے تصور میں کھو جاتے ہیں

چین و عرب ہمارا- ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن جب یہی ترانہ تھوڑی سی ترمیم کرکے ان کے ڈرامے تعلیم بالغاں میں بے گھر غریب مایوسی کی دلدل میں ڈوبے ہوئے افراد گاتے ہیں

چین و عرب ہمارا- ہندوستاں ہمارا

رہنے کو گھر نہیں ہے۔ سارا جہاں ہمارا

تو جو درد۔ سوز۔ کرب سے سسکتی ہوئی آواز ان بے گھر افراد کے دل سے نکلی تھی اس نے تو مجھے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ایک گرمی سی پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔

اسی طرح تین گھڑوں کی مدد سے ڈرامے میں پاکستانی معاشرے کی جو عکاسی کی گئی وہ کون کیسے بھول سکتا ہے۔ تین گھڑے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کے نام اتحاد۔ تنظیم۔ یقین تھے۔ استاد مکرم کہتے ہیں اتحاد ٹوٹ چکا ہے۔ تنظیم کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور یقین اپنی بنیاد یعنی پیندے سے ہی غائب ہے۔

یہی حال ان کے دوسرے ڈراموں مثلاً "لال قلعہ سے لالو کھیت تک" یا "مرزا غالب بندر روڈ پر" کا ہے ہر ایک اپنی جگہ ماسٹر پیس ہیں

خواجہ معین الدین اور ان کے دیگر ہم عصر ڈرامہ نگاروں میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ آغا حشر کے بعد بہت سے ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے لکھے لیکن انہوں نے خود ڈرامے اسٹیج کرنے کا تجربہ نہیں کیا اسے دوسروں پر چھوڑ دیا جبکہ خواجہ معین الدین نے محسوس کیا کہ جو وہ کہنا چاہتے ہیں وہ

ہدایت کار صحیح طریقے سے نہیں پیش کر سکیں گے اور یوں ان کا پیغام صحیح طور پر عوام کے سامنے نہیں جائے گا سو انہوں نے فیصلہ کیا کہ نہ صرف ڈرامے لکھیں بلکہ اسے پیش بھی خود کریں

لیکن یہ عظیم ڈرامہ نگار آخری دنوں میں نہایت مایوسی کی حالت میں تھے ۔ ایک خلش سی تھی جو انہیں اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی ۔ ان کی کامیابیاں ۔ان کے ڈرامے ۔ان کی تخلیقات ان کے چہرے پر حقیقی مسکراہٹ لانے میں ناکام رہی تھیں بلکہ ان کی روح کو گھائل ہی کر رہی تھیں ۔

ڈاکٹر نظر کامرانی اپنے مضمون روزنامہ جنگ 8 نومبر 1991 مین لکھتے ہیں کہ ایک واقعہ خواجہ معین الدین کی زندگی میں ایسا ہوا کہ انہیں ڈرامہ نویسی سے نفرت ہو گئی ۔ خواجہ معین الدین کہتے تھے یہ جو تم اپنے سامنے مجھے دیکھ رہے ہو یہ خواجہ معین الدین نہیں --اسے کوئی اور نام دے لو --

ایک مرتبہ انہوں نے دل کے اندر چھپا ہوا غم نکالا اور کہا

-- مین نے ان ڈراموں کی تخلیق کرنے کے لئے کتنی عرق ریزی سے کام کیا

کتنی دشواریوں کی گھاٹیوں کو پار کیا ۔

- کیسے کیسے مسائل آئے
- ڈرامہ لکھنے کے لئے کاغذ خریدنے سے لیکر اسٹیج بنانے تک
- اداکاروں سے اپنی پسند کے مطابق مکالمے کہلوانے کے لئے کن عذابوں سے گزرا۔
- سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ ان کی بجائے میں ایکسائز انسپکٹر بن جاتا تو اچھا تھا۔
- ایک ایکسائز انسپکٹر نے اپنی غلط حرکت سے انہیں مایوسی کا مریض بنادیا

واقعہ یہ تھا کہ ان کا ڈرامہ "'مرزا غالب بندر روڈ پر" بڑی کامیابی سے جا رہا تھا۔ ایک ایکسائز انسپکٹر نے اپنے واقف کاروں اور رشتہ داروں کو ڈرامہ مفت دکھانے کے لئے چالیس پچاس پاس مانگے۔

وہ ڈرامہ جسے خواجہ صاحب نے کئی دن رات جاگ کر ایک ایک فقرے کو کئی مرتبہ ادا کر کے خامیاں دور کرنے کے بعد لکھا تھا۔

جسے اسٹیج کرنے کے لئے گھر کا کچھ سامان بھی بیچنا پڑا تھا اسے اس ایکسائز کے سب انسپکٹر۔
۔ نے مفت پاس نہ ملنے پر بند کروادیا
کیا اس ڈرامے کی یہ حیثیت تھی کہ ایک نچلے درجے کا اہل کار جب چاہے بند کرا دے
جب چاہے چلنے کی اجازت دے دے
آیئے آج ان کی برسی کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر بصد خلوص اللہ کے حضور میں دعا کریں
کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کی منافقت کے ہاتھوں لگے زخموں کو اس دوسرے جہاں میں دائمی
ملائمت و ملاحت کی بخشش سے بھر دے
نہ جانے یہ مضمون آپ کو پسند آئے گا یا نہیں کیوں کہ چوکیدار کے پر سوز آواز والے
گانے
میرے گیت سنے دنیا نے مگر میرا درد نہ کوئی جان سکا --- نہ جان سکا" کے سبب "
میرے جمع شدہ خیالات ہوا میں آڑ گئے ہیں

کیا تمہارے ہاں بہبود کے کام جاری ہیں

اس روز بارش شدید تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ آسمان پر جتنا پانی کا ذخیرہ ہے آج ہی برس کر دم لے گا۔ اور اس سے بھی زیادہ شدید ہواؤں کے جھکڑ تھے۔ اونچے اونچے درخت ہوا کے زور سے جھکے جا رہے تھے۔ ایک کوے کے بچے نے اڑنے کی سعی کی تاکہ کہیں پناہ لے سکے، لیکن تیز ہوا نے اسے ایک پٹخنی دی وہ شاخ سے ٹکراتا ہوا نیچے درخت کے تنے کے پاس آن پڑا، اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ فی الحال کہیں نہ نکلے۔ سو دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ چل کر ایک اونچے پتھر پر پناہ لی۔ قریب ہی معصوم سی چیونٹی کا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا نام نمل تھا۔ نمل کے پرکھوں اور آباؤ اجداد نے ہزاروں برس قبل کنگ سولومن کے لشکر سے بچنے کے لیے چند احکامات جاری کیے تھے، ننھی چیونٹی نمل نے کہا: ''کوے کراؤ تمھیں پتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کہا کرتے تھے کہ جب ایسی بارش ہو تو کسی نیک ہستی کی آمد ہوتی ہے"۔ کوے کراؤ نے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اس وقت تو اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

نمل اور کراؤ کے قریب ہی ایک گھر میں حاتم طائی جدید بیٹھے بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بجلی تو بارش کی پہلی ہی بوند کے ساتھ دار الغائب کو

روانہ ہو چکی تھی۔ حاتم طائی جدید جنریٹر کا پیٹرول خدمت خلق کے جذبے کے تحت پڑوسی کی موٹر سائیکل میں ڈال چکا تھا تاکہ وہ اپنی بیمار ماں کو اسپتال لے جاسکے سو گھر میں تاریکی تھی۔ حاتم طائی جدید کی اچانک سامنے نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک ہیولہ سا سڑک پر کھلے مین ہولوں سے بچتا بچاتا ہاتھ میں عصا تھامے تن تنہا چلا آتا ہے۔ لباس پوشاک کی وضع قطع سے موجودہ زمانے کا فرد نہیں لگتا تھا۔ پیروں میں بوسیدہ سی پہاڑی چپل پہن رکھی تھی۔ سڑک پر چند بچے ایک دوسرے کی ٹی شرٹ پکڑے بھاگے جا رہے تھے وہ بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اچانک ایک بچے نے آواز دی: حاتم حاتم .... بچنا، ہیولہ جو عصا تھامے دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا۔ ایک دم .... چونک کر کھڑا ہو گیا، "ارے بچو! تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا"۔ بچے بھی کھڑے ہو گئے، نہیں نہیں ہم تو اپنے دوست کو بلا رہے تھے۔ اس کا نام بھی حاتم ہے۔ آپ کو بلانا ہوتا تو ہم انکل یا چچا کہتے۔ ہمیں بڑوں نے یہی سکھایا ہے۔'' بچے پھر پانی میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگ گئے۔ اب حاتم طائی جدید نے کہا: ''ارے میاں تم حاتم طائی تو نہیں ہو جس کا تذکرہ کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اچھے کام کرنے پڑتے ہیں۔'' ہاں ہاں میں وہی ہوں، لیکن اب کے میں تائیوان سے ہو کر آیا ہوں اس لیے لوگ حاتم طائی وائی کہتے ہیں لیکن اے بزرگ تم مجھے طائی قدیم کہہ سکتے ہو۔ میں دیکھنے آیا ہوں کہ میرے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بہبود کے کام ہو رہے ہیں یا نہیں۔ لوگوں کی مدد ہو رہی ہے۔ یا وہ اس سے محروم ہیں

سنا ہے سات سمندر پار ایک ملک کینیڈا ہے وہاں کے حکمران اس کام میں بہت .... آگے ہیں اور ان کا ملک، بہبود والا ملک کہلاتا ہے۔ حاتم طائی جدید نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا تھکان آپ کے چہرے سے عیاں ہے۔ ممکن ہو تو ایک پیالی قہوہ اخضر نوش جان فرمائیں۔ اغلب ہے طبیعت میں جو ماندگی ہے دور ہو جائے گی۔" قہوہ کی چسکی لیتے ہوئے حاتم طائی جدید نے کہا: میاں جی آپ کے زمانے میں ایک انگوٹھی ہوا کرتی تھی، ایک شیشے کا مرتبان ہوا کرتا تھا جس پر کچھ الفاظ پڑھ کر ہاتھ پھیر کر جب چاہے جہاں کا نظارہ دیکھ لیا کرتے تھے۔ وہ کہاں گئے۔ اسی میں دیکھ لیتے۔ آنے کی ناحق تکلیف کی کیا وہ خراب ہو گئے اور ان کی وارنٹی گارنٹی ختم ہو گئی ہے اور کچھ نہیں تو ہم نے بھی تمھارے شیشے کی مرتبان کی نقل میں یوٹیوب، گوگل، وکی پیڈیا وغیرہ کمپیوٹر نامی مشین پر بنائے ہیں۔ وہاں شیشے کی سطح پر سب پتا چل جاتا ہے۔ اے حاتم طائی قدیم صد افسوس تم نے وقت برباد کیا۔ مجھے ناشاد کیا۔ وہ محاورہ پرانا ہوا کہ طاقتور مچھلی کمزور مچھلی کو کھا لیتی ہے اب زمانہ یہ ہے کہ تیز رفتار مچھلی کم رفتار، مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ چنانچہ اقوام پر لازم ہے کہ ان چیزوں پر عبور حاصل کر کے دنیا میں آگے بڑھیں یہ پند و نصائح سن کر حاتم طائی قدیم کو شرمندگی لاحق ہوئی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: اے مرد دانا...... تمھاری باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن اسی دل نے کہا کہ عملی طور پر چل کر دیکھ لو تب حاتم طائی جدید نے کہا کہ اس ملک پاکستان میں بہبود کے کام جاری ہیں۔

انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ لیکن خدا کی مخلوق کی تعداد اس ملک میں بڑھتی جا رہی ہے اور ملک کے حالات بھی ایسے ہو رہے ہیں کہ بہبود کے کام جتنے بھی ہوں کم ہیں۔ان ناساعد حالات میں بھی سوشل سکیورٹی کا نظام پنپ رہا ہے۔ کراچی میں سیلانی تنظیم ہر ماہ تین کروڑ روپے کا کھانا غریب نادار، پردیسی لوگوں کو کھلاتی ہے یہ کھانا بکرے کے گوشت سے بنایا جاتا ہے۔ جو یہ تنظیم صدقے کے طور پر حاصل کرتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ باوقار انداز میں عزت نفسی مجروح کیے بغیر یہ کھانا دیا جاتا ہے۔ ایک المصطفیٰ ویلفیئر ٹرسٹ ہے جو یتیم بچوں کی پرورش نادار افراد کو گھر کا خرچ چلانے کے لیے ماہوار پیسے دیتا ہے المصطفیٰ ویلفیئر تنظیم کے سربراہ حاجی محمد حنیف طیب زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی خدمات پہنچانا چاہ رہے ہیں۔ تنظیم علم و عمل کے سربراہ سیف منظور ہیں جنھوں نے پچھلے برس ساٹھ لاکھ روپے کی خطیر رقم مختلف افراد، بچوں اور سکولوں کو دی ۔

ابھی پچھلے ہی ہفتے تنظیم علم و عمل کا سالانہ اجلاس گلستان جوہر میں ہوا۔ جن اسکولوں میں انہوں نے جدید خطوط پر "ای لرننگ" کا نظام متعارف کروایا ہے اس کا جائزہ لیا گیا بتایا گیا کہ ایک وقت انکی جانب سے غریب مستحق طلبا اور طالبات، کم آمدنی والے خاندانوں اور بیواؤں کو مدد کی جانے والی رقم ایک کروڑ سالانہ سے زاید ہو گئی تھی۔ مخیئر افراد سے درخواست کی گئی کہ اس

کام میں اپنا دست تعاون بڑھائیں۔ ان کی مدد سے کئی بچے اسکالرشپ کے نام پر مدد لیکر بغیر کسی دقت کے تعلیم حاصل کر رہے ہیں ورنہ والدین تو ہمت ہار ہی بیٹھے تھے۔
پھر عبدالستار www.ilmoamal.org علم و عمل کی اپنی ویب سائٹ بھی ہے۔
ایدھی ہیں جن کا ڈنکا عالم میں ہے۔ ان کے احسانات اس ملک پاکستان پر کیا ہیں بتاتے بتاتے یہ دن بیت جائے گا۔ لیکن بہبود کے کاموں کا تذکرہ ختم نہ ہوگا۔ لاہور میں ڈاکٹر امجد ثاقب کی تنظیم اخوت نے گزشتہ برسوں مختلف خاندانوں کو کاروبار کرنے کے لیے قرضے دیے۔ حاتم طائی جدید بتاتے جا رہے تھے اور حاتم طائی قدیم حیرت سے سنے جا رہے تھے۔ چیونٹی نمل نے کوے کراؤ سے کہا تم اڑ نہیں سکتے اور منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی، تم زخمی ہو میں اوپر جا کر تمھاری امی سے کہتی ہوں کہ تم یہاں گر گئے ہو۔ وہ آ کر تمھیں اٹھا لیں۔
یہ سب دیکھ کر، یہ سب سن کر حاتم طائی قدیم کے منہ سے نکلا " ملک کے حالات اپنی جگہ مگر اس کے باوجود تمہارے ہاں ایک دوسرے کی خیر خواہی اور بھلائی کے کام چل رہے ہیں، ان میں کوئی رخنہ نہیں آیا ہیں انہیں برقرار رکھو "
حاتم طائی قدیم اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اٹھے اور اپنا عصا تھامے آگے چلے گئے۔ موڑ کے پاس جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور میں

سوچوں میں ہوں کہ کیا طریقے اختیار کئے جائیں کہ یہ رفاہ عامہ کے کام ، بہبود کے افعال ، باہمی امداد کے شغل جاری رہیں

16 دسمبر 1971 - یوم سقوط مشرقی پاکستان

دن ایک ہے۔ اسباق کئی

جانے کیوں پیارے ہشت پہلو کے لیے یہ عشرہ (دس سے بیس دسمبر) ہمیشہ سے مایوسی، یاسیت، رنج والم کی دھندلے کر آتا ہے۔ ان کے ایک پرانے بزرگ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ حال پہلے نہ تھا۔ لیکن کب سے ہوا اس پر بھی روشنی ڈالنے والے ہی تھے کہ بجلی چلی گئی اور وہ روشنی لانے کے لیے گھر کے اندر چلے گئے۔ اس کے بعد جنریٹر اسٹارٹ کرنے کے چکر میں ایسا پڑے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ اور آج تک اسی جنریٹر بجلی کے چکرے میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس مرتبہ پھر دسمبر کا دوسرا عشرہ شروع ہوا تو دل نے کہا کہ اے دوست، دوستی کا لازم یہ ہے کہ بخوبی دریافت کرو کہ یہ کیا اسرار ہے ورنہ ایسی دوستی کیسی جو صرف شادمانی میں جاگے اور غم میں دور بھاگے سو یہ ارادہ کر کے ہم روانہ ہوئے دیکھا کہ ایک میز پر بیٹھے ہیں اور سامنے چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔

پرانے سکے، پرانے بوسیدہ پوسٹ آفس کے ٹکٹ اور ایک گھسا ہوا ردی زنگ آلود گلوب جسے وہ گھمائے جا رہے تھے۔ لیکن وہ ظالم جب بھی رکتا تو سامنے جو

ممالک آتے ان میں ایک طرف مشرقی پاکستان اور دوسری جانب مغربی پاکستان لکھا ہوتا تھا "یہ دیکھو، یہ کیا ہے۔ مشرقی پاکستان " انھوں نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ہم بھی، یہ بھی کبھی تھے آشنا۔ نئی نسل کو یاد ہو نہ ہو۔ میں بھول جانا چاہتا ہوں۔" لیکن یہ دنیا۔ یہ گلوب کیوں بار بار یاد دلا رہا ہے۔ یہ ٹکٹیں، ان کے اندر بنگالی زبان کی تحریر کیوں ماضی میں دھکیل رہی ہے۔

ہاں۔۔۔۔ یہ 16 دسمبر1971ء کا دن ہی تھا وقت تھا تین بجے اور چار بجے کا جب بھارتی جنرل جگ جیت سنگھ اروڑا نے اعلان کیا اے مغربی پاکستان کے لوگو! جو مشرقی بازو میں قیام پذیر ہو' نہ گھبراؤ۔ اب تمھاری حفاظت پاکستانی جنرل عبداللہ نیازی نہیں بلکہ بھارتی جنرل جگ جیت سنگھ اروڑا کریں گے۔ یا اللہ امان ملی بھی تو کہاں ملی۔ 16 دسمبر1971ء کے معاہدہ جنگ بندی کے الفاظ (ہتھیار ڈالنے کے معاہدہ کے الفاظ) کچھ اس طرح تھے: "لیفٹیننٹ جنرل جگ جیت سنگھ اروڑا تصدیق کرتے ہیں کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے ساتھ جنیوا معاہدہ کے تحت عزت دارانہ سلوک کیا جائے گا اور وہ تمام لوگ جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں انھیں جنرل جگ جیت سنگھ اروڑا کے تحت محافظت دی جائے گی۔

سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ اور ہم جیسی چھوٹی فہم والے لوگوں کی سوچ میں یہ بات

آئے گی بھی نہیں کہ بھائی ہشت پہلو ہمیں کیوں تلخ یادیں یاد دلاتے رہتے ہیں ہیں ۔ہمیں خوش باش رہنے دو۔ جانے وہ کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے تو تاریخ انھیں بھلا دیتی ہے۔ یہ باتیں ہمارے ذہن کی پہنچ سے بالاتر ہیں لیکن اتنا علم ضرور ہے کہ سقوط ڈھاکہ کا صدمہ کچھ لوگ نہ سہہ سکے تھے۔ اس میں باقی صدیقی بھی شامل تھے وہی باقی صدیقی جن کا شعر لوگ دہراتے رہتے ہیں۔

ایک پل میں ہم وہاں سے اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

باقی صدیقی ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔ جب انھیں سقوط ڈھاکہ کی اطلاع ملی تو وہ فرائض منصبی کے سلسلے میں ریڈیو اسٹیشن پر تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سقوط ڈھاکہ کے ساتھ ہی ان کا دل بھی ساقط ہو گیا ہو۔ پوچھتے پھر رہے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ شاید وہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ اب بھی پردہ غیب سے کوئی معجزہ ہو گا۔ لیکن رات کو جب بی بی سی سے شیخ مجیب الرحمٰن کی آواز آئی، ہم ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے ہیں تو باقی صدیقی کی روح جسم سے علیحدہ ہو گئی اور باقی صدیقی اس دنیا سے علیحدہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم نے سوچا کہ بھائی ہشت پہلو کوئی ایسا تاریخ کا رخ بھی دکھایا جائے کہ انھیں تسلی ہو لیکن پتا چلا کہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے صرف ہندوؤں نے ہی نہیں معاہدہ کیا تھا۔

ایک مرتبہ سات سمندر پار کرکے فرنگی بھی آئے تھے۔ وہ پاک و ہند کے کئی حصے اپنے زیر تسلط لے چکے تھے اور پھر سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ حیدرآباد سندھ کے میروں سے معاہدہ کر رہے تھے۔۔برطانیہ کی طرف سے کیپٹن ایشتوک موجود تھا۔ موجود تھا اور دوسری طرف حیدرآباد سندھ کے میر نور محمد، میر ناصر خان اور میر محمد بیٹھے تھے۔ کیپٹن ایسٹوک نے معاہدہ کا ڈھانچہ سنایا۔ معاہدہ کی دفعات سن کر میران حیدرآباد سندھ کے چہرے پر پہلے ناراضگی کے تاثرات ابھرے۔ لیکن انہیں پورے ہندوستان کی صورتحال بھی سامنے نظر آرہی تھی۔ فرنگی بڑھتے چلے جارہے تھے۔ سو میر نور محمد کی رنگت پیلی ہو گئی لیکن پھر دلی کیفیت پر قابو پایا اور میر نور محمد نے کہا: ’’ یہ تمھارے معاہدے کیسے ہیں۔ یہ تمھارے معاہدے تمھاری ضروریات اور مفادات کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے تم نے صرف راہداری مانگی تھی کہ تمھاری فوجیں ہمارے علاقے سے گزر جائیں گی۔ ہم نے اسکی اجازت دے دی۔ اب تم ایک دوسرا معاہدہ لے کر آگئے ہو۔ ہم سے تین لاکھ سالانہ خراج مانگ رہے ہو اور فوج کے اخراجات کے لیے 21 لاکھ الگ۔ ہمیں اگر ایسا پتا ہوتا تو ہم اپنے ملک حیدرآباد وسندھ) کی حفاظت کے لے دوسرے طریقے ڈھونڈتے... ہم بلوچ)

- ہیں، تاجر نہیں

برطانوی کیپٹن ایشتوک نے کمال عیاری سے جواب دیا- محترم میر صاحب' دوستوں کو دوستوں کی مدد کرنی چاہیے ہم آپکو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن آپ کو علم ہے ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ہمارا مقصد محض ہندوستان کی حفاظت ہی - نہیں بلکہ آپکے اس ملک کی حفاظت بھی ہے

یہ 22 جنوری 1838 ء کی بات ہے اور آخرکار 6 فروری 1838 کو میران حیدرآباد - نے مٹھائیوں کے تھال بھیج کر معاہدے اور اپنی حفاظت کی منظوری کا عندیہ دے دیا

لیکن اے دوستو ! تاریخ سخت ظالم ہے- اس کے اوراق کھنگالو تو ایسی حفاظت کا معاہدہ ملک جاپان میں بھی ملتا ہے-- جاپان- جسے امریکا جنگ عظیم دوئم میں پہلی مرتبہ دو ایٹم بم گرا کر تباہ کرچکا تھا--- کتنی حیرت کی بات ہے کہ ملک جاپان کے شہر تباہ ہوئے تھے --آدمی جاپان کے مرے تھے -معشیت یہاں کی زیرو ہوئی تھی -ایٹم کے تابکاری اثرات یہاں پھیلے تھے لیکن اس کے باوجود امریکا نے جاپان کے سینکڑوں فوجیوں کو فوجی مجرم قرار دیا اور وہ موت کی سزا کے حقدار قرار پائے- جاپان کی حفاظت کا زمہ لے کر جاپان کو بالکل غیر

مسلح کر دیا گیا۔ لیکن تاریخ بتای ہے بلکہ بتاتی کیا ہے ہمارے سامنے ہے کہ جاپانیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ جاپانیوں نے جائزہ لیا کہ اب کون کون سے شعبے ان کی دسترس میں رہ گئے ہیں جس کے ذریعے وہ دوبارہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھ سکتے ہیں۔

یہ شعبے تھے تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت، زراعت وغیرہ۔ تجارت ایسا شعبہ تھا جس سے دوسرے تمام شعبے منسلک تھے یعنی تعلیم، صحت، زراعت۔ جاپانیوں نے سائنس ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کے فروغ کے لئے بھرپور اقدامات کئے۔ اس کے نتیجے میں، کارخانوں کی مصنوعات کی کوالٹی میں انقلاب آیا اور جب یہ مصنوعات تجارت کے ذریعے دنیا میں پہنچیں تو انہوں نے امریکی، برطانوی جرمنی کی مصنوعات کو مات دے دی۔ اور ایک دن وہ آیا جب بین الاقوامی شہرت یافتہ رسالے "نیوز ویک" نے سرورق پر ایک تصویر چھاپی "جاپان، امریکہ کے اندر"۔ تصویر میں دکھایا گیا تھا ایک ٹویوٹا جیپ امریکہ کی بندرگاہ پر اتر رہی ہے۔ اب دنیا میں امریکہ کی گاڑیاں کم نظر آتی ہیں اور جاپان کی زیادہ۔ یہی حال اسٹیل کی صنعت۔ مواصلات کی اشیا۔ تفریح کے سامان مثلاً ٹی وی۔ ویڈیو گیم) وغیرہ کا ہے۔ تاریخ واقعہ بھی بتاتی ہے اور سبق بلکہ اسباق) بھی سکھاتی ہے، بشرطیکہ سبق سیکھنے والے بنیں۔

16 دسمبر 1971 ، یوم سقوط مشرقی پاکستان بھی کئی سبق دے رہا ہے۔ شرط وہی ہے کہ ہم سبق حاصل کرنے والے بنیں۔

کیا مہاتما گاندھی نے پاکستان کی خاطر گولی کھائی تھی؟

صاحبو' احوال اس ہفتے کا یہ ہے کہ اپنے پیر و مرشد جناب ہشت پہلو صاحب نے کچھ ایسے انکشافات کیے ہیں کہ ہم سب کے منہ مگرمچھ کی طرح کھلے کے کھلے ہی رہ گئے ہیں -

العجب ! العجب !

دراصل چند دنوں پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے ایک محفل میں سوال کیا کہ دوستو بتاؤ تو سہی قاتل کیسا ہوتا ہے- یاروسب کو علم ہے کہ ہر بچہ مختلف ان دیکھی ہستیوں کے بارے میں اپنا ایک تصوراتی خاکہ بنالیتا ہے- سو ہم سب نے اپنا الگ الگ راگ الاپا- ہم نے کہا کہ ہمارے ذہن میں جو تصور آتا تھا وہ اس طرح تھا کہ قاتل کی موٹی موٹی، پھیلی ہوئی، لال رنگ کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ جن سے وحشت ٹپک رہی ہوتی ہے دوسرے صاحب نے کہا کہ حضرت ان کی باتیں چھوڑیے یہ تو ایسا ہی سوچتے رہتے ہیں- قاتل کا تصور کرتے ہی خیال میں آتا ہے کہ وہ ان پڑھ جاہل ہوگا- اگر، شلوار قمیض پہنی ہوگی تو ملگجی سی- ایک پائینچا اوپر ایک پائینچا نیچے، پیروں میں مٹی سے اٹی ہوئی چپل پہنے ہوئے ہوگا- اور اگر پتلون قمیض پہنے ہوئے ہوگا تو عجب بے ڈھنگی اور میلی کچیلی جیسے مہینوں سے اتاری نہ گئی ہو -

تب میاں ہشت پہلو نے کہا بس بس میاں، دیکھ لی تم سب کی سوچ کی اپروچ اور سمجھداری کی دھاری۔ سنو ایک قاتل ایسا بھی گزرا ہے جو دانشوروں کے زمرے میں آتا تھا اور دو اخبارات کا ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا۔

تو صاحب یہ وہ بات تھی جس کے سننے کے بعد ہمارا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔

دوسرے صاحب انگشت بدنداں رہ گئے تھے اور ایک تیسرے صاحب چائے کی پیالی ہونٹوں کی جانب لے جا رہے تھے ان کا ہاتھ تو وہیں کا وہیں ساکن ہو گیا۔

" نہیں ! " سب کے منہ سے اچانک بے ساختگی میں یکبارگی نکلا۔

ہاں " بھائی ہشت پہلو نے سنجیدگی سے کہا۔ " گاندھی جی کا قتل اسی ماہ جنوری میں ہوا تھا اور قاتل ایسا نہیں تھا جیسا کہ آپ لوگوں کے تصور میں تھا بلکہ وہ تھا جو میں بیان کر رہا ہوں، اچھا یہ تو بتاؤ یہ قتل کیوں تھا؟ "

لگتا تھا کہ میاں ہشت پہلو ہم سب کے دعوے (کہ معلومات عامہ پر ہمیں پورا عبور ہے) کو آج غارت اور اکارت کی قبر میں دفن کرکے دم لیں گے۔ سو ہم سب نے شرمندوں کی سی صورت بنا لی اور قالین پر بنے بیل بوٹوں کو دیکھنے لگے۔

میاں ہشت پہلو نے مزید اضافہ کیا۔ پاکستان کی موجودہ نئی نسل کو تو چھوڑیں پرانی نسل کو بھی آج تک نہیں پتا کہ گاندھی جی نے آج سے اڑسٹھ برس پہلے 30 جنوری 1948ء کو پاکستان کی خاطر گولی کھائی تھی اور اپنی جان دی تھی، ہم سب جو محفل میں بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ تسلیم کہ بھائی ہشت پہلو معلومات کی پوٹ ہیں۔ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس بات پر بھی سر جھکا لیتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف گوشوں کی تہہ تک ان کے ذہن کی رسائی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہر بات بے چوں وچراں تسلیم کرلی جائے غلط ہے۔ میاں ہشت پہلو نے ہمیں زبردستی بٹھایا اور بولے "صاحبان و مہربان تاریخ بڑی ظالم اور سنگ دل شے ہے۔ اس کا مطالعہ بعض مرتبہ یقین کامل پر ایسے گھاؤ لگاتا ہے کہ آدمی مدتوں زخموں کی جلن محسوس کر کے بے چین ہوتا رہتا ہے۔ لیکن، ایک صحیح فرد ہونے کے ناطے سب کا فرض بنتا ہے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور وسعت قلبی سے کام لیں۔ اسی میں اقوام کی، ممالک کی اور دنیا کی بھلائی ہے اور اسی میں امن کا راز پنہاں ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب بت بن چکے ہیں، بے جان بت۔ صرف ہشت پہلو صاحب کی آواز ہی سنائی دے رہی تھی، کبھی دور سے، میدانوں، عمارتوں سے بھی زیادہ دور سے اور کبھی قریب سے جیسے چائے کے کپ کی اڑتی ہوئی بل کھاتی ہوئی بھاپ سے۔ شاید تاریخ کے چھپے ہوئے گوشے بے نقاب ہوتے ہوں تو ایسی ہی کیفیت ہوتی ہو۔ بھائی ہشت پہلو بولے جا رہے تھے۔ برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ قبول

کرنے والی کئی ہستیاں اس تقسیم کے سخت مخالف تھیں، اس میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی اور کانگریس بھی ۔ لیکن یہ امر بھی اپنی جگہ قابل غور ہے کہ جب تقسیم ہند کا منصوبہ منظور ہو گیا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا تو کئی اچھے ذہن کے حامل افراد ان خطوط پر سوچنے لگے کہ جو ہوا سو ہوا، اب دنیا کے ترازو میں پاک و ہند کے اوپر اٹھے ہوئے ہلکے پکڑے کو کیسے برابری کی سطح پر لا کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ سرحد کی دونوں جانب نفرت کے الاؤ بجھ جانے چاہئیں اور ترقی کی شمع لے کر دنیا کے آگے بڑھتے ہوئے اقوام کی فہرست میں نام ڈلوانے کی جدو جہد کرنی چاہیے ۔ اسی جذبے کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد نے خان عبدالغفار خان کو پاکستان بننے کے بعد مشورہ دیا تھا کہ اب تم مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤ ۔

جنوری 1948ء میں جب بھارت نے پاکستان کے حصے کے 55 کروڑ روپے (اور جمیل الدین عالی مرحوم کے مطابق 90 کروڑ روپے) روک لیے تو گاندھی جی پورے جی جان سے بھارت سرکار کے اس فیصلے کی مخالفت کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھوک ہڑتال پر جانے کا اعلان کیا۔ بھارت سرکار میں ہلچل مچ گئی ۔ وہ ان کی طاقت سے بخوبی آگاہ تھی ۔ چنانچہ بھارت نے فوراً پیسے کی ادائیگی کا اعلان کر دیا اور اسی روز بھارت کے ایک کٹر ہندو نے مہاتما گاندھی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس ہندو کا نام نتھورام گاڈ سے تھا۔ یہ ایک مراٹھی اخبار

اگرنی" کا ایڈیٹر و مالک تھا۔ بعد میں اس نے اخبار کا نام " ہندو راسٹرا" رکھ دیا تھا۔" نتھو رام گاڈ سے کی سوچ یہ تھی کہ بقول اس کے پاکستان میں ہندوؤں کا قتل عام کیا جا رہا تھا۔ پاکستان کشمیر میں جنگ کرکے کشمیر چھیننے کے درپے ہے ایسے میں پاکستان کو یہ پیسے دینا پاکستان کی کشمیر جنگ میں مدد کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ 30 جنوری 1948ء کو جب سورج اپنی تمازت کھو کر غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ نتھو رام گاڈ سے نے گاندھی جی کو ریوالور سے گولی مار کر ان کی زندگی کا سورج غروب کر دیا۔

بھارت میں مسلمانوں کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی وہ سمجھنے لگے کہ گاندھی کے قتل کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف تشدد کی وارداتیں، لوٹ مار کی جائے گی لیکن جب پتا چلا کہ قاتل ہندو ہے تو بھارتی مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں اس وقت تک ہائی کورٹ کی عمارت کے سامنے گاندھی کا بت ایستادہ تھا۔

اسے اس وقت تک نہیں ہٹایا گیا، البتہ اس نئی مملکت کے باشندے اخبارات کے ذریعے اسے ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ۔اس روز ایسے لگا کہ مجسمہ سوال کر رہا ہو اب کیا ارادے ہیں اور کسی نے لا کر گیندے کے پھولوں کی مالا پہنا دی۔

عدالت میں قاتل نتھو رام گاڈ سے بیان دینے کھڑا ہوا تو متواتر پانچ گھنٹے کھڑا ہو کر بولتا رہا۔ یہ بیان 90 صفحات پر مشتمل ٹائپ شدہ تھا۔ اس کا کہنا

تھا کہ مہاتما گاندھی نام نہاد اصولوں کو پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج کل کے دور میں اصولوں کا اچھا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ آیا زندگی میں ان اصولوں پر کچھ عمل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ گاندھی جی جب ہندوؤں کا قتل ہو رہا تھا تو کچھ نہیں بولے لیکن جب ہندو شرنار تھیوں (مہاجروں) نے مسلمانوں کی مساجد پر بھارت میں قبضہ کر لیا تو ان قابضین سے مساجد خالی کرانے کے لیے بیان بازی اور جدو جہد شروع کر دی۔ گاڈسے نے کہا میں نے گاندھی جی کو مارا کوئی بے جا کام نہیں کیا۔ ہندو دھرم کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ راما نے راون کو مار دیا تاکہ سیتا کو آزاد کرے، کرشنا کا سنا کو مارڈالا تاکہ مکاری و فریب کا خاتمہ ہو اور میں نے گاندھی کو ختم کر دیا، غلط نہیں کیا۔ اے ہندوؤ! اگر تم مہاتما گاندھی کے اتنے ہی شیدائی ہو تو اپنی بے عزتی یاد رکھنا، مہاتما گاندھی کی چتا کی راکھ تمام دنیا کے دریاؤں میں بہائی گئی لیکن پاکستان نے اپنے ملک میں اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ بے عزتی ہے، اس بے عزتی کا بدلہ لینا، سندھو دریا پر قبضہ کرنا اور میری راکھ اس دریا میں بہانا۔ میں نے گاندھی کو گولی ماری اس کے لیے شرمندہ نہیں ہوں۔ میری یہ گولی اس فرد کے لیے ہے جو ہندوؤں کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ اس دیش بھارت کو پاکستان سے محفوظ رکھنا تھا تو گاندھی جی کا مارا جانا ضروری تھا۔

نتھورام گاڈسے کو گاندھی کے قتل کے الزام میں 15 نومبر 1949ء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ نتھورام گاڈسے کو دانشور کہنا صحیح ہے یا وہ ایک مذہبی جنونی تھا؟

انتظار حسین -- وہ میرے غائبانہ استاد محترم تھے

آہ! انتظار حسین اب ہم میں نہ رہے

۔ محترم انتظار حسین آپ سب کے لئے کیا تھے --- مجھے علم نہیں

۔ لیکن میرے تو وہ غائبانہ محترم استاد تھے اور رہیں گے

ان کے کالم "لاہور نامہ" کی چھتری تلے جا کر میں اپنی اردو صحیح کرتا تھا - ان کا انداز سیکھتا تھا۔ اردو کے کلاسیکل انداز سے کیسے مزاح کا اسلوب تشکیل دیا جائے سے آگاہی ۔ حاصل کرتا تھا

میرے پاس ان کے دو سو تین سو کالم تراشوں کی صورت میں تھے۔ بیس تیس صفحات جو میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں ایسے ہیں جن میں انکے کالم کے فقرے نوٹ کئے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین کے یہ فقرے جو میں نے نوٹ کئے ہیں پاکستان کی ایک ۔ تاریخ بھی ایک شگفتہ انداز میں سناتے ہیں

سال 1974 -- لاہور۔ انجینئرنگ کا آخری پیپر دے دیا -- پریکٹیکل بھی سارے

ہو گئے۔ پراجیکٹ کا دلدر بھی ختم ہو چکا تھا۔ سو ساری موٹی موٹی کتابیں -- مختلف مضامین کے نوٹس -- پراجیکٹ یعنی تھیس جو آگے شروع کے ایام میں انٹرویو میں کام آنا تھا اور دیگر سامان سب ایک بکسے میں بند کیا۔ ہوسٹل سے کوئٹہ کے لئے روانگی کا وقت ہے۔ صندوق کو تالا لگانے سے قبل دوبارہ سامان کا جائزہ لیا۔ یہ جائزہ انتظار حسین کے روزنامہ "مشرق" لاہور میں چھپے ہوئے کالموں کے تراشوں کے لئے تھا جو میں انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران جمع کرتا رہا تھا۔ انجینئرنگ کی کتب نے مستقبل کے کیریئر اور نوکری میں میری مدد کرنی تھی اور ان کالموں کے تراشوں سے اپنے لکھنے لکھانے کے شوق کی تکمیل کرنی تھی۔ یہ تھا میرا اثاثہ۔ ان دونوں قسم کے اثاثوں نے میرا خوب ساتھ دیا۔

سال 2010 - نوکری سے ریٹائرمنٹ۔ پروفیشن کی کتابیں جن میں تین گنا اضافہ ہو چکا تھا سے الوداعی ملاقات کی اور بذریعہ فیس بک مختلف لائبریریوں، کارخانوں میں کام کرنے والے انجینئرز کے حوالے کیں

لیکن انتظار حسین کے کالم اب بھی نوٹس کی صورت میں محفوظ ہیں

سال 2016- ان کالموں کے خالق اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے

بہاریں آئیں گی لیکن سخن واران ادب

کبھی نہ آئے گا اب انتظار کا موسم ------ اطہر عباسی

ان کے کئی انٹرویو جو انہوں نے ٹی وی پر دیۓ تھے میں نے نوٹ کر لیتا تھا کہ اس میں وہ پاکستان ہندوستان کے اقدار کے اندر جو بدلاؤ آرہے ہیں کا تفصیلی تجزیہ کرتے اور نئی نسل کو اس کی روشنی میں زندگی گذارنے کے اصولوں پر چلنے کے لئے رہنمائی کرتے تھے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ اپنے افسانوں پر مجھے فخر ہے۔ جو کچھ بھی ہوں -- چھوٹا یا بڑا اسی حوالے سے ہوں -- ناول لکھا۔ یادیں قلم بند کیں۔ کالم نگاری تو محض پیشے کا معاملہ ہے اسے افسانے کے مقابلے میں نہیں لاؤں گا۔ انہیں اپنا افسانہ "زرد کتا" کافی پسند تھا۔ ٹی وی انٹرویو میں اسی سے اقتباس سنائے

"یہ کب ہوتا ہے کہ سب دانش مند بن جاتے ہیں"

" جب عالم اپنا علم چھپانے لگتے ہیں"

" عالم اپنا علم کب چھپاتے ہیں"

" جب جاہل عالم قرار پاتے ہیں اور عالم کو جاہل کہا جانے لگتا ہے"

آہ اب وہ رہنمائی کرنے والی زبان اب ہم سے رخصت ہو گئی۔ اب میرا کوئی

(استادنہ رہا۔ بقول طارق ہاشمی (ڈیلاس امریکہ

کٹ گئیں انتظار کی گھڑیاں

۔ اب کسی کا انتظار نہیں

صادقین -- پہلی بار کب دیکھا، پہلی بار کب سنا

-- مجھے صادقین (سید صادقین احمد نقوی) کو دو تین بار دیکھنے کا موقع ملا
پہلی بار اس وقت ، جب وہ لاہور کے عجائب گھر میں سورہ یٰسین کی خطاطی کر رہے تھے
ان کی خطاطی کی مہارت دیکھ کر میں ایک قسم کے سکتے میں رہ گیا۔ -جب برش ایک -
مرتبہ چلتا تو لفظ/حرف کی تکمیل تک رکتا ہی نہیں تھا۔ لیکن ، اس کے ساتھ ہی برش کی
رفتار نہایت تیز ہوتی تھی اور وہ خود بھی مچان پر اتنی ہی اتنی تیزی سے حرکت کر رہے
تھے۔اسٹول پر مختلف کلر کی ٹیوبز رکھی ہوئیں تھیں۔ نیچے کچھ خواتین و حضرات منہ
میں انگلیاں دابے حیرت سے ان کا کام دیکھ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ محکمہ تعلیم پاکستان
کے وفد کے اراکین تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔لیکن اس وقت صادقین کی توجہ
صرف اور صرف' سورہ رحمان کی خطاطی کی تخلیق پر تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ اللہ کے
حضور میں کھڑے اللہ کی صفات کو لکھ کر تسلیم کر رہے ہیں

- فَبِاَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

وفد میں کراچی کی ڈاکٹر فرحت جہاں (ڈاکٹر بی بی قریشی کی بہن) بھی تھیں۔ صادقین کا
اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کی جنبش پر اتنا قابو تھا کہ مجال ہے

برش انکی تصور کردہ گولائی ،زاویئے یا لمبائی سے باہر نکل سکے۔ نیچے بہت سے سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ بعد میں کسی نے مجھے بتایا تھا کہ بعض اوقات وہ کام کے دوران سگریٹ سلگاتے اور ایک کش لینے کے بعد کام میں میں اتنا محو ہو جاتے کہ دوسرا کش لینے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی اور سگریٹ ختم ہو جاتا تھا

انکو دوسری مرتبہ میں نے عجائب گھر کے باہر دیکھا تھا۔ پاجامہ پہنے وہ مال روڈ پر عجائب گھر کی بیرونی جنگلے یا غالبا" دیواریا کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں بس میں سوار کہیں جا رہا تھا۔ ڈبل ڈیکر بس تھی۔ لگتا تھا کہ کام کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ کسی کو کیا پتہ ایک بڑی شخصیت۔ ایک عظیم تخلیق کار' جس نے مصوری کو خطاطی اور خطاطی کو مصوری کا روپ دیا ہے، وہاں کھڑا ہے۔

پھر انہیں آرٹس کونسل کراچی میں انکی تصاویر کی نمائش کے موقع پر دیکھا۔ وہاں انکی تصاویر کے ویو کارڈ بھی مل رہے تھے اور وہ اپنے مداحین کو دستخط کرکے دے رہے تھے میں نے سوچا کہ کارڈوں کی قیمت بہت رکھی ہو گی لیکن حیران رہ گیا کہ قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ فن کو زر کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا جا رہا تھا۔ میں نے ایک کارڈ خریدا اور انکے سامنے رکھ دیا۔

مجھے لگا کہ وہ وہ خطاطی کے دلدادہ لوگوں کی رغبت دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں -انہوں نے دستخط ثبت کئے- کارڈ لینے کے بعد میں نے سوچا کہ اسے کسے تحفہ دیا جائے- ایسا جو قراں کو لفظوں تک محدود نہ رکھے بلکہ ان کی گہرائی میں جانے کی طلب رکھتا ہو- جو پاکستاں کی محبت کی تڑپ رکھتا ہو- پاک فوج میں میرا بھانجا تحسین-کتابوں کا شیدائی اور قران کو اصل معنوں میں سمجھنے کی لگن رکھتا تھا- میں نے یہ کارڈ اس کی خدمت میں پیش کر دیا-- حیرت کی بات ہے کشمیر کی سرحد پر اس کی شہادت کے بعد کتابوں کے دو صندوق جو بھیجے گئے تھے ان میں مارٹن لنگز کی کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں یہی کارڈ رکھا ہوا تھا -

ایک مرتبہ صادقین کو ٹی وی پر دیکھا- ٹی وی کمپئیر نے ان سے الٹا لکھنے کی فرمائش کی تھی- میز کی ایک جانب صادقین اور مخالف جانب دوسری طرف کمپئر بیٹھے ہوئے تھے صادقین نے لکھنا شروع کیا-- الٹا لکھنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر حرف "ج" لکھ رہے ہیں - تو اس طرح لکھا جائے کہ جیم کا چاند والا حصہ لکھنے والے کی جانب نہ ہو بلکہ سامنے بیٹھے فرد کی طرف ہو- اسی طریقے سے انہوں نے ایک آیت پوری کی پوری لکھ دی- حیرت کی بات یہ تھی کہ اس طریقے سے لکھنے کے باوجود تحریر کے حسن میں کسی قسم کا سقم نہیں محسوس ہو رہا تھا -

آج زمانہ بیت گیا۔ ڈاکٹر فرحت جہاں اس جہاں سے چلی گئیں۔ کرنل تحسین نے اللہ کی راہ میں بمقام کشمیر جام شہادت نوش کر لیا۔ صادقین بھی فریر ہال کے آخری فن پارے کو تکمیل کرنے کی خواہش لئے اللہ کے ہاں جا چکے ہیں۔ مجھے مختار مسعود کی آواز سنائی د ے رہی ہے " اہل شہادت ' اہل احسان اور اہل جمال کون لوگ ہیں ؟ اہل شہادت دوسروں کے لئے جان دیتے ہیں۔ محسن دوسروں کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ اور اہل جمال ۔ وجود کو تابندگی بخشتے ہیں۔ جس عہد کو یہ تینوں گروہ میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہیں "

صادقین ---پہلی بار کب سنا

ایک اچھے شاعر - ایک اچھے مصنف - ایک اچھے تخلیق کار کو ہمیشہ خوبصورت نظاروں سے بھرپور اور شور و غل سے پاک ، زمان و مکان کی تلاش رہتی ہے۔ جہاں پھول کھلیں تو ساری دنیا گل رنگ نظر آئے۔ جہاں خوشبو پھیلے تو پورا عالم معطر محسوس ہو۔ جہاں پرندوں کی بولیاں اور دھیمے دھیمے بہتے ہوئے آب جو کی آوازیں سنیں تو پوری فضاء وجد کی سی حالت میں لگے۔ قیام پاکستان کے بعد کا کوئٹہ ایسا ہی مقام تھا۔ شہر کوئٹہ کا یہی وہ دلفریب رخ تھا جس کے سبب قرۃ العین حیدر کوئٹہ گئیں۔ رئیس احمد جعفری اپنے ایک ناول کی تخلیق کے لئے

کوئٹہ قیام پذیر ہوئے۔ - اور یہی رخ صادقین کو 1951 میں کوئٹہ کھینچ کر لے گئیں۔ صادقین کو یہاں آکر، افغانستان سے موسم سرما میں ہجرت کرکے پاکستان آنے والے خانہ بدوشوں کی زندگی کے کئی پہلوؤں سے آشنائی ہوئی۔ اور ان سب کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ ارد گرد واقع حسین مناظر کینوس پر منتقل کئے اور اپنی زندگی کی پہلی تصویری نمائش 1954 کو کوئٹہ میں منعقد کی۔ کوئٹہ سے انکی الفت ختم نہیں ہوئی اور جولائی 1958 میں کوئٹہ کی ایک اور نمائش میں حصہ لیا۔ جمشید مارکر کو انکی تصاویر اتنی پسند آئیں اور انہوں نے تمام کی تمام تصاویر خرید لیں۔ بلاشبہ یہ ایک اعزاز کی بات تھی۔ صادقین نے کیا سوچا وہی بہتر جانتے ہیں۔ میں اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں۔ - کوئٹہ میں جنوری 1960 کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ برفیلی ہوائیں ہڈیوں میں گودا جمانے پر آمادہ تھیں۔ گھروں میں معدنی کوئلے کے ہیٹر سردی کا اثر زائل کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جنوری کے اس یخ بستہ مہینے میں ایک تصویروں کی نمائش ہوئی جس میں صادقین نے بھی حصہ لیا۔ اور تصاویر پر پہلے سے ہی لکھ دیا کہ یہ فروخت کے لئے نہیں ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک تصویر۔ کسے بہتر کہیں فیصلہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ان تین برسوں میں ان کے کام میں میں مزید نکھار پیدا ہو چکا تھا۔ اس کامیاب نمائش کے بعد یہ تمام تصاویر کوئٹہ کے ایک فوٹو گرافر دوست کو بلا کسی معاوضے کے عطیہ کر دیں۔ صادقین نے کیا سوچا وہی بہتر جانتے ہیں۔ میں کوئٹہ میں رہائش رکھتا تھا

دنگ رہ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان کا نام سنا۔ زاہدہ حنا نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سردیوں کے موسم نے کہانیوں کو جنم دیا۔ صادقین نے طویل سرمائی راتوں کو مختصر کرنے کے لئے ایک موضوع دے دیا تھا ۔

اس کے بعد کئی مرتبہ صادقین کا نام سنا۔ منگلا میں انکی تخلیق کردہ بڑی طویل تصویر بھی دیکھی ۔ ان کی لکھی ہوئی رباعیوں کے بارے میں بھی سنا۔ مصر میں ایک خطاط کو انکی مدح میں رطب اللسان بھی دیکھا اور پتہ چلا کہ نہ صرف پورے عالم عرب میں بلکہ فرانس، رومانیہ، انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی انکی تخلیقات ایک خاص مرتبے کی حامل ہیں اور لوگوں کے لئے ایک خصوصی کشش رکھتی ہیں۔انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ حسن کارکردگی، تمغہ امتیاز۔ ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔ بلاشبہ وہ اس کے حقدار تھے ۔ لیکن وہ آج میرا موضوع نہیں ہے۔ میں نے تو صرف یہ بتانا تھا کہ میں نے سب سے پہلے کب ان کا نام سنا تھا اور سب سے پہلے کب انہیں دیکھا تھا

دس فروری 1987 کو کو صادقین اس فانی جہاں سے رخصت ہوئے۔ التماس ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت پڑھ لیجئے۔ آمین

تعمیر پاکستان کے گمنام معمار

جون 1994 کی شب تھی جب دو بجے ہمارے ابا جان کا سایہ ہمارے سر سے ہمیشہ 15 کے لئے ہٹ گیا۔ یہ ہم سب کے لئے اندوہناک سانحہ تھا۔ اس وقت سب بہن بھائیوں نے اپنے اپنے انداز میں اس غم کو برداشت کرنے کی سعی کی۔ لیکن ایسے لگ رہا تھا کہ بھائی جان اس کمی کو کسی اور انداز سے محسوس کر رہے ہیں۔کیا یہ میں سمجھ نہیں رہا تھا پھر تین چار دن بعد بھابی کا فون آیا کہ رات کو جب سب طرف سناٹا چھا گیا -- -
خاموشی پھیل گئی تو وہ خود بخود رونے لگ گئے تھے۔ ہم دو تین دن بعد بھائی جان کے گھر گئے تو بھائی جان نے بتایا کہ انہوں نے اپنے جذبات ' خیالات اور احساسات ایک ٹوٹی پھوٹی تحریر کے قالب میں ڈھال دیے ہیں۔ اس تحریر کی مختلف احباب نے قطع و برید کی۔ یہی تحریر میں آج یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس طرح سے یہ تحریر میرے والد معظم کی داستان حیات کا خلاصہ ہے اور تدفین کے دوران ہماری دلی کیفیت کا ایک بیان بھی ہے

الکھ نگری کے ممتاز مفتی کی طرح میری طبعی ساخت بھی کچھ ایسی ہے کہ کسی غمناک واقعہ پر مجھے ایک دم صدمہ نہیں ہوتا بلکہ واقعہ کے بیت جانے کے بعد اداسی اور غم کے گہرے بادل دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو

جاتا ہے اور اگلے چند روز میں آنکھوں سے غم کی بارش ہونے لگتی ہے۔ یوں محسوس ہو تا ہے کہ ایک طوفان اٹھا اور سر سے گزر گیا۔ میں اس طوفان کی تباہ کاریوں سے اپنے دل و دماغ میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے ان کی مرمت میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ لیکن دل و دماغ کی دنیا میں کچھ ٹوٹ پھوٹ ایسی بھی ہوتی ہے، جس کی میں دوبارہ مرمت نہیں کر سکتا اور یہی اس ' غمناک واقعہ کی' یادیں بن کر ساری عمر میرے ساتھ رہتی ہیں -

اس سے پہلے بھی دو مرتبہ بھی ایسی کیفیت سے گزرا تھا۔ ایک اپنے محسن ماموں سید عبدالحمید صاحب کی رحلت کے موقع پر دوسرا اپنے مجبی سسر کرنل نظام الدین صاحب کے انتقال کے وقت -

والد محترم کی وفات پر یہی حالت ہوئی لیکن بعینہٖ ایسے نہیں -

ذہن پر اداسی اور غم کے بادل چھائے ، گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوا۔ گرج چمک کے ساتھ بجلی کوندی اور سوئم کے بعد چوتھے روز شام پانچ بجے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح غم کے بادل برس پڑے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں غم کی بارش جاری ہو گئی۔ بارش کو تھمنا ہوتا ہی ہے چاہے وہ طوفان نوح ہی کی بارش کیوں نہ ہو۔ چنانچہ یہاں بھی آخر کار یہ غم

ویاس کی بارش رک گئی۔ دل و دماغ کی اس دنیا میں ٹوٹ پھوٹ جو ہوئی میں اس کی توٹ پھوٹ کی مرمت میں لگ گیا۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ طوفان تو سر سے گزر گیا ہے لیکن ایک بے نام اداسی کے بادل ابھی تک دل و دماغ میں چھائے ہوئے ہیں۔ ان سے ملال اور رنجیدگی، بوند بوند ٹپک کر، میری رگوں کے اندر بہتے ہوئے خون میں شامل ہو رہی ہیں۔

ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا؟ اب کیوں ہو رہا ہے؟

انتقال پر ملال

----

15 جون 1994 کی صبح چار بج کر پچپن منٹ پر میری آنکھ اچانک کھل جاتی ہے۔ میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ آنکھ ایسے اچانک کھلنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی البتہ دوبارہ آنکھ بند کرکے لیٹنے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ پھر خیال آتا ہے کہ اب اگر آنکھ کھل ہی گئی ہے تو آج صبح کی نماز پڑھ لی جائے۔ میں باتھ روم میں وضو کے ارادے داخل ہوا۔ ابھی باتھ روم میں داخل ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ بیڈ روم کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ جو باتھ روم میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ میں ہمیشہ بے وقت کے فون کالز سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں کیونکہ ایسے بے وقت کے فون ہمیشہ کسی ایمرجنسی کے ہوتے ہیں۔ ابھی میں باتھ روم میں ہی ہوں فون کی مسلسل گھنٹی سے میری بیگم عذرا کی آنکھ کھل

جاتی ہے۔ وہ فون اٹینڈ کرتی ہیں ۔ پھر جلد ہی باتھ روم کے دروازہ پر دستک دیتی ہیں
۔ اور کہتی ہیں

۔ اسٹیل ٹاؤن سے منیر احمد (یعنی میرے چھوٹے بھائی) کا فون ہے

اچھا میں آرہا ہوں -- میں کہتا ہوں

میں باتھ روم سے باہر آتا ہوں ، اسٹڈی کرسی پر بیٹھتا ہوں اور فون پر بات کرتا ہوں دوسری جانب سے آواز آتی ہے۔

میں منیر احمد بول رہا ہوں۔ رات ڈیڑھ بجے ابا جان کی طبعیت خراب ہو گئی تھی ۔ میں انہیں لیکر الحدید میں واقع پولی کلینک گیا۔ وہاں پر ڈیوٹی ڈاکٹر نے ابا جان کو انجیکشن لگا یا اور گھرلیجانے کی اجازت دے دی ۔ واپسی پر ابا جان کو خورشید باجی کے گھر لے گیا وہاں دلیہ بنوایا تاکہ اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد انہیں کھلا سکوں۔ میں ابا جان کو اپنے گھر لے آیا۔ دلیہ کھلانے کی کوشش کی لیکن دلیہ ابا جان کے منہ سے باہر نکل نکل آتا تھا۔ اس کے بعد طبیعت مزید خراب ہو گئی اور وہ صبح کے تقریباً تین بجکر بیس منٹ پر اس ۔ جہاں فانی سے رخصت ہو گئے

۔ میں نے پوچھا اس وقت آپ کے پاس کوئی موجود ہے

ہاں ، سردار (یعنی میرے بہنوئی) میرے پاس ہیں

منیر احمد ، ہم دس منٹ کے بعد دوبارہ بات کریں گے۔ میں نے کہا۔ ذرا میری بات ۔ سردار سے کروانا

پھر ٹیلی فون پر سردار کی آواز آئی۔ ہیلو

سردار کیا خورشید (میری بہن) کو ابا جان کے انتقال کی خبر ہے ؟ میں نے پوچھا

جی نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آپ اور عذرا بھابھی آکر انہیں یہ خبر دیں۔ ورنہ وہ مجھ سے نہیں سنبھالی جائیں گی۔

اچھا۔ اب ہم آپ کے یہاں آنے کی تیاری کرتے ہیں۔ دس منٹ بعد دوبارہ فون کروں گا۔

میں فون بند کرتے ہوئے، کرسی کی پشت کی جانب سے پیچھے عذرا کو دیکھا جو بیڈ پر پاؤں لٹکائے، چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی ہیں۔

میں نے کہا-- ابا جان کا انتقال ہو گیا ہے۔

ہاں، وہ آہستہ سے بولیں

میں سمجھ گیا کہ میرے باتھ روم سے باہر آنے تک منیر احمد نے عذرا کو ابا جان کے انتقال کی خبر دے دی تھی لیکن وہ چاہتی تھیں کہ میں خود یہ خبر اپنے بھائی کی زبانی سنوں۔

منیر احمد نے جب مجھے یہ خبر فون پر سنائی اس وقت صبح کے تقریباً پانچ بجے تھے۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے چار بجکر پچپن منٹ پر مجھے نیند سے بیدار کر دیا تھا کہ میں پورے ہوش و حواس میں اپنے والد محترم کے انتقال کی خبر سنوں۔ میں نے عذرا سے کہا کہ آپ بچوں کو جگائیں اور انہیں انکے دادا

- کے انتقال کی خبر دیں- وہ اٹھ کر بچوں کے بیڈ رومز کی جانب جاتی ہیں

پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لاالہ الا اللہ

میں اپنے بیڈ روم میں تنہا رہ گیا- بیڈ روم میں ٹائم پیس کی "ٹک ٹک "اور ایر کنڈیشنز سے نکلتی ہوا کی مسلسل "سائیں سائیں" کے سوائے اور کوئی آواز نہیں ہے۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ میں اپنی اسٹڈی کرسی پر نہیں بلکہ ایچ جی ویلز کی ٹائم مشین میں بیٹھا ہوا ٹائم پیس کی "ٹک ٹک "اور ایر کنڈیشنز کی "سائیں سائیں" کے ساتھ ماضی کی سمت محو سفر ہوں اور بالآخر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک خاص زمان و مکان میں پہنچ کر رک جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ تو دیکھتا ہوں کہ جنوری 1949 کا زمان ہے- ہندوستان کے شہر میسور کا ایک مکان ہے- ایک شخص اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ پاکستان کے لئے رخت سفر باندھ رہا ہے- یہ شخص میرے والد بشیر احمد ہیں- بیوی اور دو بچے - میری والدہ، میں اور میری چھوٹی بہن خورشید سلطانہ ہیں

میرے والد سے ان کی والدہ، بھائی اور بہنیں کہہ رہے ہیں کہ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے کہ تم پاکستان جارہے ہو؟ وہاں تمہیں کوئی جانتا تک نہیں کہاں ٹھہروگے؟ کیا کروگے؟ نہ تمہارے پاس کوئی خاص تعلیم ہے اور نہ تمہارے پاس پیسہ ہے کہ تم وہاں - جا کر کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار کرسکو

- میں کاروبار کے لئے نہیں بلکہ تعمیر وطن کے لئے جا رہا ہوں

! تم اور تعمیر وطن

- ہاں میں اور تعمیر وطن

کیسے ؟

اللہ تعالٰی میری رہنمائی کرے گا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مملکت خداداد کی آزاد فضا میں جینا چاہتا ہوں ---- اور ہاں -- اب جبکہ میں پاکستان جارہاہوں میں دوبارہ ہندوستان کی زمین پر قدم نہیں رکھوں گا۔ اب میں ایک آزاد فضا میں جیوں گا۔ ایک آزاد فضا میں مروں گا اور ایک آزاد زمین میں دفنایا جاؤں گا۔ ۔پاکستان کے باشندے ہی میرے سب کچھ ہوں گے۔ ان کے ساتھ ہی میرا جینا اور مرنا ہوگا ۔

بچپن سے لیکر ہوش سنبھالنے تک والد محترم نے ہمیں یہی ذہن نشین کرایا کہ

مذہب تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسلام

قومیت تمہاری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پاکستانی

ذات تمہاری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسلمان

اس طرح انہوں نے "پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لا الہ الا اللہ" کے نعرہ

کو حقیقت کا رنگ دے دیا۔ ۔ نتیجتاً آج میرا یہ ایمان ہے کہ میں صرف ایک مسلمان ہوں اور ایک پاکستانی۔ نہ سنی، نہ شیعہ، نہ بریلوی، نہ دیو بندی، نہ مہاجر، نہ پنجابی، نہ سندھی، نہ بلوچ، نہ پٹھان ۔

کاش ! پاکستان کے ہر باپ نے اپنے بچوں کو یہی سبق دیا ہوتا تو آج پاکستان میں سندھی ، پنجابی ، پٹھان بلوچ یا مہاجر نہیں ہوتے صرف پاکستانی ہوتے۔

میسور (انڈیا) کے باسی ہونے کے ناطے والد مرحوم کے شعور میں ٹیپو سلطان کا مقولہ " شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے" خوب رچ بس گیا تھا۔ وہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی دل سے پاکستانی ہوگئے اور اس کو ترجیح دی کہ پاکستان کی آزاد فضاؤں میں تنگی ترشی ہندوستان کی فضاؤں میں آرام وآسائش سے لاکھ گنا بہتر ہے۔ ہجرت کی ابتداء بمبئی سے بذریعہ بحری جہاز کراچی آمد کی صورت میں ہوتی ہے۔ پاکستان کی آزاد فضاء تو ضرور ہے لیکن کسی سے جان پہچان نہیں۔ سب ناآشنا۔ ہجرت کا سفر جاری ہے کراچی سے لاڑکانہ، شکارپور، کوئٹہ اور آخر کار اسکول ٹیچر کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے ایک دور افتادہ قصبہ نوشکی پہنچتے ہیں اور اس طرح ہجرت کا ایک طویل سفر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

والد محترم کو پاکستان کی فضاؤں میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ سب اپنے لگتے ہیں سب محبت و خلوص کے پیکر۔ اس وقت سب پاکستانی تھے اور مسلمان ۔

تھے۔ ٹیپو سلطان کے دیس کا باسی ' مملکت پاکستان کو ٹیپو سلطان کی خواہش کی تکمیل دیکھتا ہے اور اپنے دل و جان کی گہرائیوں سے وطن عزیز کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ یعنی اپنے اور وطن کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں۔

استاد کا مقدس پیشہ

والد محترم نے اپنے ذاتی رویہ سے استاد کے مقدس پیشے کا وقار کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اس مقدس پیشے کے تقدس کو پیش نگاہ رکھا۔ انتہائی تنگی ترشی کی حالت میں بھی کبھی بچوں کو ٹیوشن، معاوضہ کے عوض نہیں پڑھائی۔ اسکول کی اسٹیشنری گھر نہیں لائے۔ اپنے بچوں کی تعلیم کا سامان ہمیشہ اپنی تنخواہ سے خریدا۔ اپنے شاگردوں یا ان کے والدین سے کبھی کوئی تحفہ قبول نہیں کیا حالانکہ ایسا وقت بھی آیا جب گھر میں روٹی کے لئے آٹا میسر نہیں ہوتا تھا۔ امریکن امداد میں اسکول کے بچوں کے لئے خشک دودھ کے ڈبے ملا کرتے تھے۔ لوگوں نے والد محترم کو یہ دودھ کے ڈبے فروخت کرنے کی بہت ترغیب دی، لیکن اس کے باوجود کہ مالی حالات ابتر تھے انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اسی عرصہ میں والدہ صاحبہ ٹی بی کی مریضہ ہو گئیں۔ مالی حالات حد درجہ گر گئے تب بھی والد محترم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار

- رہے اور صبر و قناعت کی ایک زندہ مثال پیش کی

تعمیر پاکستان

میری والدہ صاحبہ کو ٹی بی ہو جاتی ہے اور انہیں فاطمہ جناح ٹی بی سینی ٹوریم کوئٹہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ والد محترم کی درخواست منظور ہوتی ہے اور محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر صاحب، والد محترم کا تبادلہ " کلی بادینی --- نوشکی " سے کوئٹہ کے ایک پرائمری اسکول میں کر دیتے ہیں تاکہ وہ کوئٹہ میں مقیم رہ کر سینی ٹوریم میں والدہ صاحبہ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ میں نے آٹھویں جماعت کے بورڈ کے امتحان کی وجہ سے نوشکی میں اپنے ماموں سید عبدالحمید (مرحوم) کے پاس قیام کیا۔ یہ 1958 کا زمانہ ہے۔ ایوب خان کا مارشل لاء لگا ہوا ہے اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کے لئے ''کلیم'' جمع کرانے کا اعلان ہوتا ہے۔ میں نے نوشکی میں ہفت روزہ اخبار "میزان" میں یہ خبر پڑھی اور دل میں بہت خوش ہوا کہ والد محترم نے بھی انڈیا میں اپنی چھوڑی ہوئی پراپرٹی ''کلیم'' ضرور داخل کرایا ہوگا۔ میں آٹھویں جماعت کا امتحان دینے کے بعد بذریعہ بس، دن بھر کے سفر کے بعد شام کو کوئٹہ پہنچتا ہوں۔ ۔بس اسٹاپ پر والد صاحب محترم مجھے لینے کے لئے تشریف لائے۔ میں نے بس سے اترنے کے بعد ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''آپ نے کلیم تو ضرور داخل کرا

''دیا ہوگا

" کون سا کلیم ؟ نہیں بیٹا میں نے داخل نہیں کرایا "

" کیوں ؟"

" کیوں ؟

''بیٹا۔ ہم پاکستان اس لئے نہیں آئے کہ ہم پاکستان سے کچھ کلیم کریں''

ہم پاکستان کی تعمیر میں حصہ لینے آئے ہیں۔ آپ اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر دیں۔ انشاء اللہ وقت آنے پر آپ پاکستان میں ہی صاحب جائیداد ہوں گے۔ اس وقت یہ سن کر میرا یہ خواب کہ پاکستان میں اپنا بھی کوئی مکان ہوگا ٹوٹ گیا۔ لیکن الحمد اللہ آج میں صاحب مکان ہوں۔

جب میں کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ نوشکی جانے سے پہلے ' ایک سال ہم کوئٹہ میں رہے تھے ' تو محکمہ کسٹوڈین سے ایک مکان شراکت کی بنیاد پر الاٹ ہوا تھا اور جب نوشکی کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو مکان میں اپنی شراکت والا حصہ پیچھے رہنے والے شریک مکان کو بلا کسی معاوضہ کے دے دیا تھا۔ جب اس بات کا علم مجھے ہوا تو اس وقت مجھے والد محترم کا یہ فعل اچھا نہیں لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آج مجھے ان کے اس فعل پر بہت بڑا فخر ہے۔

کئی سالوں کے بعد میں نے سنا اور پڑھا کہ امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی نے اپنی عوام سے کہا تھا۔ " یہ مت پوچھو کہ امریکہ تمہیں کیا دے رہا ہے بلکہ یہ

پوچھو کہ تم امریکہ کو کیا دے رہے ہو"۔ تب اچانک میرے دماغ میں فلیش ہوتا ہے کہ والد محترم نے بھی تو کچھ اسی قسم کی بات کی تھی۔ ''بیٹا' ہم پاکستان اس لئے نہیں آئے کہ ہم پاکستان سے کچھ کلیم کریں' ہم تعمیر پاکستان میں حصہ لینے آئے ہیں۔ اگر وہ ایک عظیم ملک کے ایک عظیم صدر کا اپنی عوام سے خطاب تھا تو پھر یہ عظیم پاکستان کے ایک عظیم باپ کا اپنے کم سن بچے سے خطاب تھا۔ واہ رے میرے عظیم پاکستانی باپ! کاش! ہر پاکستانی باپ اپنے بچوں کو ایسی نصیحت کرتا تو آج ہم پاکستانیوں کا یہ برا حال نہ ہوتا۔

سنئے! سنئے" کی آواز مجھے ٹائم ٹنل سے باہر لے آتی ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں" اپنی اسٹڈی کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں اور میری اہلیہ عذرا مجھے یاد دلا رہی ہیں" "دس منٹ ''ہو چکے ہیں۔ آپ نے منیر احمد سے کہا تھا کہ دس منٹ کے بعد دوبارہ فون کروں گا "اوہ! اچھا کیا آپنے مجھے یاد دلا دیا۔ منیر احمد انتظار کر رہے ہوں گے۔

یہ کیا کہ والد محترم کی زندگی کے یہ روشن پہلو مجھ پر اسی وقت عیاں ہوئے جب میں ٹائم ٹنل میں گیا تھا یا پھر ان کی موت نے میری آنکھوں کے سامنے سے وہ دنیاوی پردے ہٹا دیئے اور میرے ذہن میں عرصہ سے جس آئیڈیل پاکستانی مسلمان باپ کا تصور تھا وہ آئیڈیل مجھے اپنے والد مرحوم کی شخصیت میں نظر آیا۔ میری فون پر دوبارہ منیر احمد سے بات ہوتی ہے۔ نماز جنازہ تدفین کا

وقت اور تدفین کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ تمام متعلقہ لوگوں کو فون کرنے کے بعد ہم الحدید کے لئے روانہ ہوتے ہیں اور پچیس کلو میٹر کا سفر طے کرتے ہوئے'' الحدید''
۔ منیر احمد کے گھر پہنچ جاتے ہیں

پاکستان کے لوگ ہی میرے سب کچھ ہیں

میں ' عذرا اور بچے سیدھے ڈرائنگ روم میں والد محترم کے جسد خاکی کے پاس پہنچتے ہیں اور وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ میری نگاہیں والد محترم کے چہرے پر ٹک جاتی ہیں۔ ٹائم ٹنل میں جس عظیم باپ کو دیکھا وہ آج زندگی کا ایک طویل اور بامقصد سفر طے کرنے کے بعد ایک گہری میٹھی نیند سو چکا ہے۔ اس عظیم باپ نے سینتالیس سال پہلے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ہجرت کے بعد وہ پاکستان کی آزاد فضا میں آخری سانس تک رہا۔ سفر کے لئے مالی استطاعت رکھنے کے باوجود اس نے دوبارہ ہندوستان کی زمین پر قدم نہیں رکھا اور پاکستان کی آزاد فضا میں ' اپنی جان ' جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس عظیم باپ نے اپنے گزرے ہوئے کل کو ہمارے آج کے لئے قربان کیا۔ تمام رشتے ناطے اور تعلقات اس ارض مقدس کے لئے قربان کئے۔ اچانک یہ خیال آتا ہے کہ آج مجھے جو باعزت مقام حاصل ہے وہ میرے والد محترم کی بہترین تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔
الحمداللہ انہوں نے اگر ایک طرف مجھے دین کی اعلیٰ تعلیم سے

آراستہ کیا تو دوسری جانب مجھے دنیا میں سلیقہ سے زندگی گزارنے کے عمدہ شعائر سے بھی روشناس کرایا۔ روز قیامت اللہ کی بارگاہ میں مجھے یہ شکایت ہرگز نہیں ہوگی کہ میرے والد نے میری دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی کی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ ۔انشاء اللہ اس اعتبار سے بھی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہوں گے

یہ کیا؟ ایک طرف ذہن میں ان افکار کا جوار بھاٹا اور دوسری طرف آنکھوں سے !آنسوؤں کا خاموش تلاطم' نہ کوئی سسکی !نہ کوئی آہ

کیا یہ والد محترم کی وفات کا غم ہے؟ یا روح کی گہرائیوں سے عقیدت کا نذرانہ۔ اس ۔باپ کے لئے جو ''پاکستان'' کا مطلب ۔۔۔۔۔۔۔لا اللہ الا اللہ ''کا مجسم نمونہ تھا

میری اور منیر احمد کی موجودگی میں والد محترم کے جسد خاکی کو غسل' ان کے پوتے' حماد اور جہاں زیب احمد دو معزز حضرات کی زیر ہدایت دیتے ہیں۔ ان دونوں معزز حضرات نے والد محترم کی میت کو غسل دینے کی رضاکارانہ پیشکش کی تھی۔ ظہر کی نماز کے کے بعد نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ قبرستان میں والد محترم کے جسد خاکی کو لحد میں ان کے بڑے پوتے جہاں زیب احمد اتارتے ہیں۔ اس میں ان کے چھوٹے پوتے حماد احمد' جہاں زیب احمد کی مدد کرتے ہیں۔ لحد

میں میت اتارنے کے بعد سیمنٹ کے سلیب رکھے جاتے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ میت گاڑی کے باریش ڈرائیور صاحب اپنے ہاتھوں سے مٹی کا گارا بنا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ سیمنٹ کے سلیب میں گارے کی بھرائی بھی کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا پہلے کبھی کسی اور کی تدفین میں نہیں دیکھا۔ عام طور پر گارے کا یہ کام تو گورکن ہی کرتا دیکھا گیا ہے۔ قبر پر سلیب رکھنے اور گارے سے بھرائی کا کام مکمل ہوتا ہے۔ اکثر ہوتا تو یوں ہے کہ تدفین میں شامل تمام حضرات فرداً فرداً اپنے ہاتھوں سے قبر پر مٹی ڈالتے ہیں اور قبر سے ہٹ جاتے ہیں تاکہ باقی مٹی عام طریقہ کار کے مطابق گورکن اپنے بیلچہ سے قبر پر ڈال سکے۔ لیکن یہاں پر ایسا نہیں ہوتا بلکہ تدفین کے شرکاء میں سے چند معززین آگے بڑھتے ہیں اور گورکن سے بیلچے مانگ کر ماہ جون کی چلچلاتی دھوپ میں، پسینہ سے شرابور ہونے کے باوجود قبر پر خود بیلچے سے مٹی ڈالتے ہیں۔ ان معززین کا پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق ہے اور یہ مختلف مادری زبانیں بولتے ہیں۔ والد مرحوم کے ساتھ ان کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ انہوں نے والد مرحوم کے اچھے کردار اور شخصیت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ ان کی تدفین میں شرکت کی اور عقیدت سے انہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی دی۔ دراصل اللہ اس موقع پر لوگوں کو یہ دکھا رہا تھا کہ والد مرحوم نے ہندوستان سے ہجرت کے وقت درست ہی کہا تھا کہ پاکستان کے باشندے ہی ان کا سب کچھ ہوں گے۔ اب وہ انہی کے ساتھ جئیں گے اور انہیں کے ساتھ مریں گے۔ دفنانے کے بعد قبر پر

پانی چھڑکاؤ کیا جاتا ہے اور پھول ڈالے جاتے ہیں۔ والد مرحوم نے پاکستان ہجرت کرتے وقت پاکستان کی آزاد سرزمین میں دفن ہونے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا آج ان کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر آتی ہے اور میں ان کی یادوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں بسا لیتا ہوں ۔

راہ سلوک کا ایک گمنام سالک

تدفین کے بعد ' شرکاء میں سے دو معزز حضرات قران کی تلاوت کر ہی رہے ہوتے ہیں کہ میں ان مولوی صاحب کو جنھوں نے والد مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی تھی قبرستان میں اپنی جانب آتے ہوئے دیکھتا ہوں

مولوی صاحب کے قبر پر پہنچنے سے ذرا پہلے تلاوت ختم ہو جاتی تی ہے۔ اس موقع پر مولوی صاحب والد مرحوم کی قبر کی جانب اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

میں آپ سب حضرات کو ان بزرگ کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ مرحوم ایک'' نہایت نیک نمازی اور پرہیزگار شخص تھے۔ چھوٹے بڑوں کو سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ وہ ایک سچے پاکستانی اور پکے مسلمان تھے۔ بس یہی بتانا مقصود

''تھا

آیئے اب ان بزرگ کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں'' مولوی صاحب جو مسجد''
کے امام بھی ہیں کہتے ہیں۔ لوگ دوبارہ اپنے ہاتھ دعا کے لئے بلند کر دیتے ہیں
شرکائے تدفین میں سے زیادہ شرکاء کا تعلق اسٹیل ٹاؤن اور الحدید سے تھا۔ بعد میں
بہت شرکاء نے ہمیں بتایا کہ محترم امام صاحب کو ہم نے آج تک قبرستان میں آکر کسی
کے بارے میں اس طرح کے خصوصی کلمات کہتے نہیں سنا جیسے کہ آج انہوں نے آپ
کے والد مرحوم کے لئے کہے۔ منیر احمد نے والد مرحوم کی تدفین کے چوتھے روز مجھے
بتایا کہ جناب مولوی صاحب تدفین کی شام اپنے استاد محترم کے ہمراہ ان کے گھر تشریف
لائے اور مرحوم کے حق میں مغفرت کی دعا اپنے استاد محترم سے بھی کرائی۔
میں نے اب تک پچاسیوں تدفینوں میں شرکت کی ہوگی لیکن کبھی اس قسم کے واقعات
میرے مشاہدے میں نہیں آئے جیسے کہ والد محترم کی تدفین کے وقت مثلاً
غسل کے موقع پر ایک بزرگ کا اپنے طور پر خدمات پیش کرنا --
میت گاڑی کے باریش ڈرائیور صاحب کا بذات خود والد مرحوم کی قبر کے لئے ہاتھوں --
سے ''گارا'' بنانا۔اس گارے کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر قبر تک لے جانا

اور قبر پر رکھے ہوئے سیلیوں پر لگانا

وہ لوگ جو کہ نہ تو رشتہ دار تھے اور نہ احباب لیکن پھر بھی سخت گرمی کے موسم میں --
والد مرحوم کی قبر پر بیلچوں سے مٹی ڈالنا- ان کی مجھ سے یا منیر احمد سے کوئی دنیاوی
غرض بھی نہیں تھی

مسجد کے محترم امام صاحب کا بلا کسی دنیاوی غرض کے بذات خود جون کے مہینے کی --
چلچلاتی دھوپ ییں موٹر سائیکل والے سے لفٹ لیکر قبرستان پہنچنا اور والد مرحوم کے
لئے نیک کلمات کا ادا کرنا- -- جناب امام صاحب کا اپنے استاد محترم کو لیکر منیر احمد
-کے گھر آنا اور ان سے والد مرحوم کے حق میں مغفرت کی دعا کروانا

یہ سب کیا تھا؟

- کیا ان سب لوگوں نے یہ سب کچھ دیناداری کے لئے کیا؟ نہیں ہر گز نہیں

اگر یہ دنیاداری نہیں تھی تو اللہ نے اپنی خلق کو نقارہ خدا بنا دیا کہ وہ جو دنیاوی طور پر
ایک سچے پاکستانی'ایک آیڈیل باپ تھے- دینی طور پر راہ سلوک کے ایک گمنام سالک
تھے - انہوں نے راہ سلوک کی کتنی منزلیں طے کیں اس کا علم تو اللہ کو ہی ہوگا- البتہ
- اتنا یقین ہے کہ والد مرحوم اللہ تعالٰی کے ہاں بھی سرخرو ہوں گے

نذرانہ سلام

میں سلام کرتا ہوں کہ اس شخص کو کہ جو "پاکستان کا مطلب --
کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔لاالہ الااللہ" کا عملی نمونہ تھا۔ میں سلام کرتا ہوں اس شخص کو جس
نے کبھی نہ پوچھا کہ پاکستان نے اسے کیا دیا بلکہ ہمیشہ دیکھا کہ اس نے پاکستان کے لئے کیا
- کیا
میں سلام کرتا ہوں اس شخص کو کہ جو تمام عمر سادگی' ایمانداری، قناعت' صبر اور --
- شکر کا پیکر رہا
میں سلام کرتا ہوں اس شخص کو کہ جس نے وطن عزیز کے بچوں کی تعلیم و تربیت --
- کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی
میں سلام کرتا ہوں اپنے عظیم باپ کو کہ جس نے مجھے سب کچھ دیا لیکن مجھ سے لیا --
کچھ بھی نہیں
میں اپنی والدہ محترمہ کو بھی سلام کرتا ہوں جو ہمیشہ والد محترم کے قدموں کے --
ساتھ قدم ملا کر چلتی رہیں اور کسی بھی موقع پر شکایت کا ایک حرف زبان پر نہیں
- لائیں اور نہ ہی کسی ناحق کام کے لئے اکسایا

بھائی جان کے ان تاثرات اور اباجان کی ہجرت کے واقعات اور پاکستان میں رہنے

کے انداز فکر کو کو مختلف اخبارات اور جرائد نے اپنے صفحات میں جگہ دی تھی اور اپنی آراء کا اظہار بھی کیا۔ میری نظر میں یہ آراء ایک قوم کو اپنی منزل کی راہوں کا تعین کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے انہیں بھی ایک امانت سمجھ کر پیش کر رہا ہوں

پاکستان سے محبت کرنے والا ایک عظیم انسان -- بشیر احمد۔ ایسے لوگ نئی نسل کے " لئے ایک مثال ہیں، سرمایہ حیات ہیں، جنھوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان " کر دیا

ماہنامہ نوائے حق۔ اکتوبر 1994

مرحوم ایک نہایت نیک، نمازی، اور پرہیزگار شخص تھے۔ چھوٹے بڑوں کو سلام" " کرنے میں پہل کرتے تھے۔ وہ ایک سچے پاکستانی اور پکے مسلمان تھے

امام مسجد اور سابق رکن صوبائی اسمبلی

جون 1994

جس نے پاکستان سے لیا کچھ نہیں مگر اپنی زندگی کا ایک ایک سانس اس کی تعمیر کے لئے " " وقف کئے رکھا

ماہنامہ۔ اردو ڈائجسٹ۔ اگست 1995

ہمیں فخر ہے کہ وطن عزیز پاکستان میں ایسے بلند کردار کے لوگ بستے ہیں۔ آپ کی "ذات روشنی کے مینار کی طرح سے تھی"

ایڈیٹر ماہنامہ - رابطہ - لندن - 19 اکتوبر

اداکار حبیب مرحوم

اداکار حبیب مرحوم اب جبکہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ عام اداکاروں سے ہٹ کر تھے--- اداکاری کے لحاظ سے بھی اور عام زندگی میں اپنے رہنے کے اطوار سے بھی۔ اس کی بنیادی وجہ انکی تعلیم اور گھریلو تربیت تھی۔ وہ 1934 کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اینگلو عربک اسکول دہلی سے حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان 1947 میں پاس کیا۔ قیام پاکستان کے بعد نومبر میں پاکستان آ گئے۔

اس ابتدائی تعلیم نے ان کے اندر مزید تعلیم کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ فلمی زندگی کے دوران ہی انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں مزید دو ایم اے بھی کئے۔ اس طرح سے وہ تین ایم کی ڈگریاں (اردو۔ انگریزی۔ فارسی) رکھتے تھے۔ علی گڑھ کی تعلیم کا اتنا اثر ہوا تھا کہ جب بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے کسی فارغ التحصیل فرد سے ملاقات ہوتی تو حفظ مراتب، یعنی سینئر۔ جونیئر کے ادب آداب کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ہجرت کے بعد ابتدائی ایام مالی لحاظ سے نہایت دشواری کے عالم میں گزرے تھے

۔ انہوں نے اپنا خرچ چلانے کے لئے شارٹ ہینڈ کی تربیت بھی حاصل کی ۔

ان کی فلمی زندگی میں آنے کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ 1956 کی بات ہے وہ بی اے فائنل کے طالب علم تھے۔ وہ اپنے کسی دوست کے ہمراہ اسٹوڈیو سیر کرنے گئے تھے۔ وہاں فلم "لخت جگر" کے ہدائت کار لقمان موجود تھے۔ وہ فلم کے ایک اداکار کے انتقال کے سبب پریشان تھے۔ وہ کسی مناسب اداکار کی تلاش میں تھے اور مختلف افراد اس مقصد کے لئے انٹرویو دینے آئے ہوئے تھے لیکن ہدایت کار لقمان کی نظر میں کوئی بھی نہیں جچ رہا تھا۔ ہدایت کار کی نظر حبیب پر پڑی تو انہیں حبیب کے اندر نہ جانے کیا بات نظر آئی انہوں نے انہیں زور دیا کہ وہ بھی انٹرویو دیں۔ حبیب مرحوم نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس سے قبل نہ کبھی اسکول کالج میں کسی ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ جب کہ وہاں جو افراد انٹرویو دے رہے تھے ان کا کسی نہ کسی لحاظ سے ڈراموں سے تعلق تھا ۔ ہدایت کار لقمان کے بہت زیادہ اصرار پر وہ بھی انٹرویو میں پیش ہوئے ۔ ایک جوہری نگینے کو' چاہے نگینہ کسی بھی حال میں ہو پہچان لیتا ہے۔ سو یہی صورت حال یہاں کی بھی تھی۔ حبیب منتخب ہو گئے اور یوں حبیب نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ پہلی فلم یہی "لخت جگر" تھی ۔

ان کی ابتدائی فلموں میں "آدمی" اور "زہر عشق" بھی تھیں۔ دونوں اپنی جگہ

ایک مقام رکھتی تھیں ۔ فلم "آدمی" کو نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لیکن حبیب مرحوم سمجھتے تھے کہ "زہر عشق" میں ان کام کافی مشکل اور پیچیدہ نوعیت کا تھا ۔

1960 میں ایک فلمی رسالے "ایسٹرن فلم" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ فلم میں اداکاری نہ صرف اب ان کا شوق بن چکا ہے بلکہ اب روزی کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے وہ اپنی اداکاری میں حقیقی رنگ دینے کی پوری سعی کرتے ہیں۔ 1960 میں کہی گئی بات کو انھوں نے تمام عمر نبھایا اور اداکاری کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا۔ نوجوان نسل جو کیرئر اور ملازمت کے بارے میں پوچھتی رہتی کہ کامیابی کے زینے کیسے چڑھ سکتے ہیں کے لئے ایک درس چھوڑ گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک پر عزم آدمی شکست نہیں قبول کر سکتا۔ "ایسٹرن فلم" کے ایک انٹرویو میں اس بات کی تلقین کرتے ہوئے وہ اسلام کے ایک عظیم فرزند' شیر میسور ٹیپو سلطان کی مثال دیتے ہیں ۔

یہ تعلیم اور والدین کی تربیت کا اثر ہی تھا کہ وہ فلمی دنیا کے غلط کاموں سے ہمیشہ دور رہے ایک فلم "آخری داؤ" میں انہیں ایک شرابی آدمی کا کردار کرنا پڑا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ معمولی سی شراب پی کر اداکاری کرو تو

اداکاری کو ایک حقیقت کا روپ مل جائے گا اور اس میں نکھار آ جائے گا۔ ۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کردار کو ادا کرنے کے لئے بہت زیادہ مشق اور مشقت کرنی ۔ پڑی۔ لیکن انہوں نے یہ محنت کرنا قبول کر لیا

جب انہوں نے اداکارہ نغمہ سے شادی کی تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تھا " اللہ کرے یہ شادی کامیاب رہے " میں اداکار حبیب کے زندگی کے اطوار سے آگاہی رکھتا تھا ان کے ذہنی رجحان اور نغمہ کے ذہنی رجحان میں کافی فرق تھا۔ یہ شادی کامیاب نہ ہو ۔ سکی۔ لیکن علٰحیدگی باوقار طریقے سے ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک گھریلو خاتون سے شادی کی اور آخر تک کامیاب زندگی گزاری۔ بچے ان سے محبت کرتے تھے کہ عملی زندگی میں باپ کے روپ میں ایک نہایت ہی شفیق انسان تھے۔ ایک مرتبہ "جیو" ٹی وی کے سہیل وڑائچ نے ان کے ساتھ ایک پروگرام "ایکدن جیو کے ساتھ " کیا تھا۔ اس میں سہیل وڑائچ نے چبھتے ہوئے سوالات بھی کئے لیکن وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے جواب دیتے رہے۔ اور یہی انکی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ ایک تین سو گز کے گھر میں رہ رہے تھے۔ اس بارے میں سوال کیا کہ "آپ نے کتنا کمایا۔ اور اب تین سو گز کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ کیا صدمہ نہیں ہوتا " اداکار حبیب نے کہا کہ "اتار چڑھاؤ زندگی کا حصہ ہیں "

انہیں دوسرا نگار ایوارڈ فلم "ثریا" میں دیا گیا۔ ان کی دوسری قابل ذکر

فلمیں سپیرن، اولاد، ایاز، مہتاب، ماں کے آنسو، خاندان، آشیانہ، ہیں ۔ وہ اپنی پنجابی فلموں کے سبب بھی کبھی لوگوں کے دلوں سے نہیں اتر سکیں گے ۔ یار مار، دل دا جانی، بابل دا ویہڑہ، دنیا پیسے دی، چن مکھناں، سجن بے پرواہ، ٹیکسی ڈرائیور، جی دار ات خدا دا ویر فلموں کا نام سنتے ہی اداکار حبیب کی اداکاری یاد آتی ہے۔ اس کے علاوہ، انہوں نے پشتو اور سندھی فلمیں بھی بنائیں۔ حکومت نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ انہوں نے 218 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ۔

مشہور کالم نگار عبدالقادر حسن، ان کی وفات سے ایک ہفتہ قبل، اپنے کالم مطبوعہ 18 فروری 2016 میں لکھا" فلمی دنیا میں زندگی اور جوانی بسر کرنے کے باوجود فلمی عادات و خرافات سے پاک رہا۔۔ اور خاندانی شرافت زندہ رہی۔ ۔۔ مجھے ایسے لوگ کم ہی ملے"

اور یہی میرا بھی کہنا ہے ان کی فلمی زندگی میں کوئی اسکینڈل نہیں بنا۔۔ عملی زندگی میں ایک کامیاب شفیق باپ تھے۔۔ فلمی دنیا کی خرابات سے پاک رہے
آیئے ان کی مغفرت کے لئے دعا کریں کہ اللہ ان کی لغزشوں کو درگزر کر اور

۔ انہیں اپنے یہاں اعلیٰ مقام عطا کر۔ آمین ۔۔ یا رب العالمین

یاسمین خان - پشتو فلموں کی پہلی ہیروئن

پندرہ اپریل کا دن آیا اور گزر گیا
کسی نے اسے یاد نہ کیا
فلمی صنعت میں کام کرنے والے ویسے ہی روزمرہ کی طرح اپنے کاموں میں لگے رہے
- -- فلمی حلقوں میں بھی کوئی صدا نہ اٹھی -- سناٹا ہی رہا۔ گڈو خان تو یاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کروں گا کہ بے حسی کی ساکت جھیل میں کنکر پھینک کر ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کنارے پر پڑے پتھر ویسے ہی پڑے رہے۔ کہیں ایک گل بھی تو نہ کھلا
پندرہ اپریل -- پشتو فلموں کی پہلی ہیروئن یاسمین خان کی وفات کا دن ہے
جب کہیں پشتو فلموں کی بات ہوتی ہے تو مجھے پہلی پشتتو فلم "یوسف خان شیر بانو" یاد آجاتی ہے اور پھر یاسمیں خان، جو اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ نہ جانے کیوں یاسمین خان کے جسد خاکی کا تصور گھوم جاتا ہے۔ سر پر گولی لگی ہوئی ہے اور جما ہوا خون کہہ رہا ہے

میرے ہونٹوں کا تبسم دے گیا دھوکا تجھے
تو نے مجھے باغ جانا -- دیکھ لے صحرا ہوں میں

اس نیکدل خاتون کی ساری زندگی جدو جہد سے عبارت رہی۔ محنت ، ریاضت ، مشقت اور اس کے بعد کسی فلم میں ایک سین بھی مل گیا تو چہرے پر شادمانی کی لہریں کہ کچھ تو صلہ مل گیا ہے آگے بھی کامرانی ضرور میرے نصیب میں آئے گی۔ لوگ اپنی آٹو گراف ان کے سامنے رکھتے اور وہ اکثر ایک ہی فقرہ لکھتی تھیں "جوندیو جہد دے " یعنی زندگی جد و جہد ہے

بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور والدہ نے دوسری شادی کر لی ۔ یوں یہ اپنی دادی کے پاس پرورش پاتی رہیں۔ نیکدل اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب اس نے دیکھا کہ پشتو فلموں میں عریانیت کا رنگ زیادہ ہی در آنے لگا ہے تو آہستہ آہستہ ، خاموشی سے فلموں سے کنارہ کشی کر لی ۔

یاسمین خان کا اصل نام شمشاد تھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں لیکن تینوں ناکامی سے ہمکنار ہوئیں۔ تیسری شادی پشاور کے ہی عارف اللہ سے ہوئی اور یہی شادی انکی موت کا سبب بنی۔ عارف اللہ کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی تھے جب کہ یاسمین خان ان سے کوسوں دور تھی۔ جانے کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ جو خاتون فلموں میں کام کرتی ہے وہ منفی اطوار کی مالک ہوگی۔ وہ ایک سادہ سی خاتوں تھیں۔ ان کا من بھی ایسا ہی اجلا تھا۔ اسی تنازع میں یہ عظیم ادکارہ گولی

- کانشانہ بنیں - سر پر گولی لگی تھی

ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں دو اداکارائیں ہیں جو اس قسم کے حالات سے دو چار ہوئیں - ایک مینا کماری (ماہ جبین) اور دوسری پشتو فلموں کی اداکارہ یاسمین خان - دونوں ہی شوہر کے غلط رویے کانشانہ بنیں - مینا کماری نے خود کشی کی یازہر دیا گیا - یہ سوالات بھی اٹھے تھے لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ مینا کماری آخری دنوں میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھیں اور کمرے میں بند کرکے اپنے عالم تنہائی کو مزید بڑھالیا تھا - بھارت میں مینا کماری پر کئی مضامیں وکتابیں لکھی گئیں ہیں - پاکستان میں - یاسمین خان پر بھی کتابیں اور مضامیں لکھنے کی ضرورت ہے

پاکستان پولیس کو تحقیقات کے سلسلے میں یاسمین خان کی قبر کی دوبارہ کھودنے کی ضرورت پیش آئی تھی - یاسمین خان کی صاحبزادی قرۃالعین بتاتی ہیں کہ قبر میں ان کا جسد خاکی بہت ہی صحیح حالت میں پایا گیا تھا یہاں تک کہ گلاب کی پتیاں جو تدفین کے دوران اندر قبر میں گرگئیں تھیں ویسی ہی تازہ تھیں - قرۃالعین ایک فضائی کمپنی میں -ایئر ہوسٹس کے طور پر کام کر رہی ہیں

یاسمیں خان کا تیسرا شوہر بعد میں کسی گینگ وار میں گولیوں کانشانہ بن گیا

تھا۔ ایک ویب سائٹ کے مطابق عارف اللہ خان کے والدین عارف اللہ کی تدفین میں
۔ شریک نہیں ہوئے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی لغزشوں کو درگذر فرمائے اور انہیں جوارِ رحمت میں
جگہ دے۔آمین

(اس مضموں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں گڈو خاں کا شکر گزار ہوں)

------ وہ بھیانک رات

جب ہمیں پتا چلا کہ اپنے بھائی حاتم طائی جدید ، اپنے ٹی وی اینکر ساتھی ، خان خاناں ہشت پہلو ، کے تمام سوالوں کے جواب نہیں دے سکے اور بھائی حاتم طائی جدید کی سپلی آ گئی ہے (یعنی دوبارہ آ کر صحیح جوابات دینے کو کہا گیا ہے) تو ہم حیرانی کے گرداب میں پھنس گئے

ہم نے کہا میاں حاتم کچھ دے دلا کر پاس ہو جاتے۔ یہ کیا کیا ؟ اپنے نام کو بٹہ لگا لیا۔ وہ بولے اے حضرت منہ نہ کھلواؤ۔ سخاوت کے نام پر ہم فضول خرچی کر کے کنگال ہو چکے ہیں۔ پیارے یہ نیا زمانہ ہے۔ نئے رنگ ہیں۔ اس زمانے میں ہماری دریا دلی یہ رنگ لائی ہے کہ لوگوں نے خوشحالی پائی ہے اور ہمارے حصے میں بد حالی آئی ہے اور یہ الزام الگ کہ اب حاتم طائی پیسے لے کر کام کرتا ہے

ہم نے تسلی تشفی دی اے بھائی تمھارے ملال ، ہمارے ملال ہیں ۔ تمھارا غم ہمارا غم ہے ۔ بتاؤ تو سہی کہ ہشت پہلو نے کیا سوال کیا تھا جس کا جواب دینا تمھیں محال ہوا اور ۔ یوں تمھاری شہرت کو زوال ہوا اور سپلی کا قصہ و احوال ہوا

وہ بولے وہ سوال تھا " بھارت کی اس بستی کی خبر لاؤ جو تین دسمبر کی

درمیانی شب ایک بادسموم کا شکار ہوئی تو آناً فاناً ویران ہوئی اور ہزاروں لوگوں کی "موت کا سبب بنی۔

تو بھائی حاتم طائی جدید تم نے کیا کیا۔

ہم نے کیا کرنا تھا" حاتم طائی جدید نے کہا۔ بس یہ کیا کہ دوپہر کو جب دھوپ نکل" آئی اور سورج سوا نیزے کو پہنچا تو گھر سے نکلے اور اس دھوپ میں دوڑ لگائی۔ یعنی دوڑ دھوپ کی کہ ہمارے زمانے کے ایک ستینا سی بابا کا مشورہ تھا کہ ایسی دوڑ دھوپ کے سبب دماغ کے خلیے کھلتے ہیں اور دماغ میں صحیح جواب آتے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس ، آج کل کی دھوپ میں بھی ملاوٹ ہو گئی ہے ورنہ ستیناسی بابا کے نسخے تیر ۔ بہدف ثابت ہوتے ہیں

حاتم طائی جدید کا بیان جاری رہا کوئی کمرشل بریک بھی نہیں آیا۔ حاتم طائی کہہ رہے تھے کہ وہ دل میں ناشاد ہوئے اور سوچا کہ تف ہے ایسی زندگی پر جو کسی کے کام نہ آئے ۔ سو وہ کلفٹن کے ساحل پر چلے گئے اور کرائے کے ایک نحیف و نزار گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے پرانے وطن یمن کے اسٹائل پر زور سے ایڑھ لگائی ۔ اس بدبخت نے یکبارگی عجب سی آواز نکالی اور خود ایک طرف ڈھیر ہوا اور حاتم طائی جدید دوسری جانب ریت پر جا پڑے ۔ اچھا ہوا بچپن میں کیلشیم کی چند گولیاں لوگوں سے بچالی تھیں ، لوگوں میں نہیں بانٹی تھیں اور خود نگل لی تھیں جس کے سبب ہڈیاں مضبوط ہو گئی تھیں۔ سو اس حادثہ میں ہڈیاں سلامت

رہیں۔ ایک اونٹ جو قریب بیٹھا دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہا تھا اور آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا اپنے ساتھی گھوڑے کا یہ حال دیکھا تو ایک دم زقند لگائی اور یہ جا وہ جا۔ ورنہ حاتم طائی جدید کا ارادہ تو تھا کہ اونٹ پر بیٹھ کر جواب کی تلاش میں جائیں اور من کی مراد پائیں۔ اس کے بعد حاتم طائی جدید کی ہمت جواب دے گئی اور یوں بھائی ہشت پہلو کی تحقیق خراب ہو گئی۔

ہم نے بھائی حاتم طائی سے کہا تمھاری بے خبری لائق حیرت ہے۔ تم یوٹیوب کے اندر کیوں نہیں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک جہاں آباد ہے۔ حاتم طائی قدیم بھی ہوتا تو اپنی جان ضیق میں نہیں ڈالتا اور یوٹیوب میں داخل ہو کر سات سوالوں کے جواب پاتا۔ ہاں ایک دوسرا نگر بھی ہے۔ گوگل نگر۔ اس میں بھی جائیں اور سوالوں کے جواب پائیں۔

حاتم طائی جدید نے کہا: ''پہلے میں اس کی آزمائش کر لوں تب تمہاری بات پر یقین کروں اب رخصت ہوتا ہوں اور خبر لاتا ہوں "

ہم نے دعا دی ''میاں جیسی پیٹھ دکھاتے ہو ویسے ہی صورت بھی دکھائیو۔ گوگل نگر کی تلاش میں کسی اور غلط قسم کی ویب سائٹ میں نہ گھس جائیو اور اصل راہ سے بھٹک جائیو۔ امام ضامن کی ضمانت میں "

ہمارا خیال تھا کہ اب وہ ہفتوں شکل نہیں دکھائیں گے اور اچھا ہی ہے۔۔ گھر

میں چینی کہاں ہے جو چائے بنا کر پلا سکیں۔ لیکن صاحبو حیرت ہوئی اگلی صبح ہی دروازے پر دستک دی۔ ابھی تو کوے وغیرہ بھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ایک کوے کی مچھر کے کاٹنے کے سبب نیند خراب ہو گئی تھی اور وہ کائیں کائیں کرکے ساتھی کوؤں کو اٹھا رہا تھا۔ حاتم طائی جدید کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ انھوں نے یوں ہم سے خطاب کیا' ذرا کان دھر کے سنو۔ یوٹیوب والے نے کہا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ آج سے ٹھیک پچیس سال پہلے بھارت کی بستی بھوپال میں دو اور تین دسمبر 1984ء کی شب ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے دنیا بھر کے کیمیکل انجینئرز کو ہلا کر رکھ دیا ایک ملٹی نیشنل کارخانہ تھا--- یونین کاربائیڈ انڈسٹریز لمیٹیڈ-- جو جراثیم کش ادویات بناتا تھا۔اس کارخانے کے اندر ایک صنعتی حادثہ ارد گرد کے ہزاروں آدمیوں کی موت کا باعث بنا۔ کارخانے کے اندر ایک بڑا ٹینک بنا ہوا تھا جس میں کیمیائی مادہ میتھایل آئسوسائی نیٹ رکھا ہوا تھا۔ اس ذخیرہ رکھنے والے ٹینک کو ٹینک نمبر 610 کا نام دیا گیا تھا۔ دو دسمبر اور تین دسمبر کی درمیانی شب کو پانی کے پائپ کے والوہ میں خرابی ہوئی اور اس کا پانی بہتے بہتے اس ٹینک میں داخل ہو گیا۔ پانی اور میتھائیل آئسو سائنائیڈ میں ایک کیمیائی عمل شروع ہوا اور ایک زہریلی گیس بننا شروع ہوئی جس کا درجہ حرارت 1200 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ یاد رہے کہ پانی 100 ڈگری سینٹی گریڈ پر ابل جاتا ہے اور لوگوں کے جسم پر آبلے ڈال دیتا ہے۔ پانی کا ٹینک اتنی زیادہ

گیس کا دباؤ اور اتنا زیادہ درجہ حرارت برداشت نہ کر سکا اور کرتا بھی کیسے جبکہ وہ اتنے زیادہ پریشر اور ٹمپریچر کے لیے بنایا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیس باہر نکلی۔ یہ زہریلی جراثیم مارنے والی گیس بھوپال میں واقع۔انو نگر، بلیو مون کالونی، ایوب نگر، غریب نگر اور دیگر علاقوں میں پھیل گئ۔ اس کے ساتھ ہی زہریلا پانی بھی ارد گرد پھیل گیا۔ یہ حادثہ ایسا تھا کہ تین ہزار سے چار ہزار کے قریب افراد تو اسی رات کو لقمہ اجل بن گئے اور اگلے تین دنوں میں مرنے والوں کی تعداد دس ہزار ہو گئ۔ اس واقعہ کو آج بتیس برس ہو گئے ہیں اور مرنے والوں کی تعداد تیئیس (23) ہزار کے قریب ہو چکی ہے۔ جن لوگوں نے اس خطرناک رات کو زہر والی ہوا اپنے پھیپھڑوں میں اتاری تھی اس کے اثرات اب بھی ان کے جسم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ماؤں کے دودھ میں ' ماؤں کے حمل میں ' نوزائیدہ بچوں میں ' لوگوں کے خون میں۔ بلا شبہ وہ ایک وحشت ناک اور بھیانک رات تھی۔ لوگ بھاگنا چاہ رہے تھے لیکن گیس کے اثر کے سبب ان کی آنکھیں بے کار ہو چکی تھیں۔ایک قیامت صغریٰ تھی۔ بھوپال کے متاثرین ہیروشیما کے متاثرین لگ رہے تھے۔ وہ پانی جو ٹینک 610 سے نکلا اور قریب کی بستیوں میں داخل ہوا اس نے الگ تباہی مچائی۔ اس زہر آلود پانی کے اثرات ،زیر زمین پانی اور کنوؤں کے پانی میں عرصہ دراز تک محسوس ہوتے رہے۔ اس صنعتی حادثہ کے پانچ سال بعد ایک کنوئیں سے پانی کا نمونہ حاصل کیا گیا اور اس کے اندر مچھلی چھوڑی گئ تو چند ہی

لمحوں میں وہ مچھلی موت کے منہ میں چلی گئی -

حادثہ کیوں ہوا ؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں

ایک رائے یہ تھی کہ وہ زہریلا مادہ جسے میتھائیل آئسو سائنیٹ کہتے ہیں کھلے ٹینک میں نہیں رکھنا چاہیے تھا بلکہ بند ڈرموں میں رکھنا چاہیے تھا - کچھ کا کہنا تھا کہ پانی کے پائپ کے پھٹنے سے یا کسی والوکے صحیح نہ کام کرنے کے سبب پانی ٹینک میں داخل ہوااور اس ہولناک حادثے کا سبب بنا -

"اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے مشیر جناب عثمان قاضی صاحب ابھی کچھ عرصہ قبل بھوپال سے ہو کرآئے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ سانحہ بھوپال کے سبب اندھے پن اور پھیپھڑوں کے مستقل ناکارہ ہونے کے شکار افراد اب بھی مل جاتے ہیں - دوستوں کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے حادثات سے روک تھام کے لئے پانچ مختلف مراحل میں حفاظتی انتظامات موجود تھے لیکن متعلقہ محکموں کی بے توجہی یا کم توجہی کے سبب ناکارہ پڑے ہوئے تھے -"

ہمارے ملک پاکستان میں بھی درجنوں کارخانے ہیں جو کیمیائی اشیاء بناتے ہیں - جراثیم کش دوائیاں، کیڑے مارنے کے پاؤڈر، کھالوں کی ٹینری کے کارخانے - ان میں کام کرنے والے افراد کو چاہیے کہ معمولی سے معمولی خرابی کو بھی سنجیدگی سے لیں اور اسے معمولی نہ سمجھیں - وہ ایک بڑے حادثے کا باعث بن

سکتی ہے جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے یا کسی مستقل روگ کا باعث بھی بن سکتا ہے -

درج ذیل دو فقرے کیا کہہ رہے ہیں ذرا پڑھیں :

ہم نے قرب و جوار کی کئی بستیاں تباہ کر دیں تاکہ لوگ ان پر غور کریں عقل (1) مندوں کے لیے اس میں بے شمار نشانیاں ہیں (اشارے) ہیں۔

اللہ کی نشانیاں (اشارے) عقل مندوں کے لیے ہیں (تاکہ وہ اس سے نصیحت (2) حاصل کریں (

یہ دو فقرے سورۃ طٰہٰ کی آیت 128 اور 54 سے لیے گئے ہیں۔ پاکستانی کیمیائی صنعت سے متعلقہ افراد بالخصوص کیمیکل انجینئرز کو چاہیے کہ بھوپال کے صنعتی حادثے کا قرآن مجید کی ان دو آیتوں کی روشنی میں جائزہ لیں۔ اسٹور ڈیپارٹمنٹ والے اسٹوریج کے متعلق اپنا علم بڑھاتے رہیں۔ گھر میں کام کرتی ہوئی خواتین بھی گیس کے چولھوں کی بابت ہشیار رہیں -

اقوام متحدہ کے تحت ہر برس تیس اپریل کو لوگوں کو آگاہی دینے کے لئے "کام کرنے کی جگہ پر صحت و حفاظتی تدابیر کا دن" منایا جاتا ہے۔ اس روز سورہ طہٰ کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرنا چاہئے اور کام کرنے کی جگہ پر صحت و

حفاظت کے اقدامات کرنے چاہئیں -

ایک مرد نیک کی کہانی

مرد نیک کا نام تھا جناب رئیس احمد۔

پاکستان ریلوے مغل پورہ لاہور سے ان کا تعلق تھا جہاں پاکستان بننے کے بعد بھارت سے آکر آباد ہوئے تھے۔ بعد میں ان کی ٹرانسفر کراچی ہو گئی تھی۔ جناب رئیس احمد کو خطاطی اور کتابت کا بہت شوق تھا اسی سبب اپنے شوق کی خاطر ہاتھ سے کتابت کا کوئی کورس بھی کر لیا تھا۔

جب وہ نوکری سے ریٹائر ہوئے تو انہیں جناب افضل حق کی کتاب "زندگی" کا فقرہ تنگ کرنے لگا کہ اللہ نے جو نعمت دی ہے اس کا شکرادا کرنے کا کم سے کم طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت میں دوسروں کو شریک کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ اپنا فن کتابت اللہ کی راہ میں لگایا جائے اور یوں اور اس کے فیض میں دوسروں کو شریک کیا جائے۔

انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ایک کتابچہ بنام "اپنی باتیں" برائے اسلامی معلومات اپنے ہاتھ سے کتابت کرکے دو سو کی تعداد میں چھپوائے۔

وہ کہتے ہیں کہ ماضی میں وہ وہ کسی عالم مولانا محمد ایوب کے دروس میں شرکت کیا

کرتے تھے۔ ان کی مجالس میں جاتے تھے اور جو وہ کہتے تھے اسے اپنی نوٹ بک میں تحریر کر لیا کرتے تھے۔ اسی طرح دوسرے علمائے کرام کی محافل سے بھی اکتساب کرتے اور ان کے بھی نوٹس بنالیتے تھے۔ اس طرح انکے پاس علم کا اچھا خاصہ خزانہ بن گیا تھا۔ ان کا یہ کتابچہ انہی دروس سے کشید کی ہوئی معلومات پر مشتمل تھا۔

جناب رئیس احمد صاحب کے تعلقات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں تھا چنانچہ انہوں نے اپنے احباب سے درخواست کی کہ یہ کتابچہ صحیح افراد تک پہنچادیں۔ وہ اس مد میں کچھ رقم ڈاک کے سلسلے میں خرچ کرنے پر بھی تیار تھے۔

جن احباب سے نے تقسیم کی گزارش کی تھی ان میں ایک صاحب پاکستان نیوی میں کسی اچھے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ پاکستان نیوی کے ان صاحب نے کچھ نہیں کیا بس یہ کیا کہ جنگ اخبار میں اشتہار چھپوا دیا کہ یہ کتابچہ فلاں صاحب سے بلا کسی قیمت کے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ ہوا یہ کہ رئیس بھائی کے گھر خطوط کا تانتا بندھ گیا اور سات آٹھ سو کے قریب مطالبے آ گئے۔۔ ان درخواست نما خطوں میں میرا خط بھی شامل تھا۔ میں رئیس بھائی سے واقف نہیں تھا۔

رئیس بھائی حیرت میں رہ گئے کہ یہ اشتہار کس نے چھپوایا ہے۔ جنگ اخبار والے کہہ رہے تھے کی یہ ان کی پالیسی کے خلاف ہے کہ چھپوانے والے کا نام بتایا جائے۔ خیر رئیس بھائی کے اصرار پر انہوں نے نام بتادیا۔ رئیس بھائی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے کہ میں مزید کام کروں اور ان نیک تعلیمات کو آگے پہنچاؤں۔ سو انہوں نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور مزید کتابچے چھپوا کر طلب کرنے والوں کو بھیج دیے۔ ٹکٹ کے اخراجات خود برداشت کئے اس کے بعد اپنے ذاتی (گھر کے نہیں۔ اپنے ذاتی) اخراجات کم کئے اور ہر ماہ ہاتھ سے کتابت کرکے سب افراد کو ماہوار کتابچہ بنام 'اپنی باتیں' بھیجتے رہے۔ ۔یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس رسالے میں زیادہ تر مواد انہی نوٹس سے استفادہ کرکے لکھا جاتا تھا جو انہوں نے مختلف علمائے کرام کی صحبت میں بیٹھ کر حاصل کئے تھے۔

لیکن جب مہنگائی کے سبب اخراجات ان کے بس سے باہر ہوگئے تو اس ماہوار کتابچے کی ترسیل کے لئے کچھ معاوضہ ڈاک کی ٹکٹوں کی صورت میں رکھ دیا۔ وہ بھی نصف صاحبان ادا کرتے۔ اور نصف نہیں۔ لیکن رئیس بھائی نے اس کی اشاعت جاری رکھی اور سب کو رسالہ بھیجتے رہے۔ مہنگائی کا سانپ اپنی گرفت سخت کر رہا تھا اور جناب رئیس بھائی مقابلہ کئے جا رہے تھے۔ انہوں نے رسالہ سہ ماہی کر دیا لیکن اشاعت بند نہیں ہونے دی۔ خوبصورت بنانے کے لئے اس کا ٹائیٹل رنگین کردیا۔

عمر ڈھلنے کے سبب اب ان کے ہاتھ کتابت میں ان کی مدد کرنے سے عاری ہونے لگے اور اس وقت تک کمپیوٹر اردو کتابت آ چکی تھی سو اب وہ اپنے اس رسالے کی کمپیوٹر سے کمپوزنگ کرانے لگے۔ زندگی کے آخری مہینوں میں جب آخر مہینوں میں جب صحت نے بالکل جواب دے دیا تو مجبور ہو کر اس رسالے کی اشاعت بند کردی۔

میری ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئیں تھیں۔ وہ بھی اس رسالے کے واجبات ادا کرنے کے سلسلے میں اور ان سے واقفیت کا ذریعہ بھی وہی اشتہار بنا تھا جو جنگ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ ان ہی رسالے سے اخذ کرکے میں نے کچھ اچھے مضامین انگریزی میں لکھے اور بیرون ملک سوفٹ ویر میڈیا میں چھپے۔ ان کے ایک چراغ سے کئی چراغ روشن ہوئے اور ان کی روشنی دنیا میں پھیلی۔

مختار مسعود "آوازدوست" میں لکھتے ہیں "افریقہ کے جنگلوں میں ایک شخص زندگی کے معنی تلاش کر رہا تھا۔ مغربی ساحل کے وسطی جنگل میں اس کی کشتی ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں پانی نایاب تھا اور مگرمچھ اتنی کثیر تعداد میں تھے کہ کشتی ان سے ٹکرائے بغیر آگے جا ہی نہیں سکتی تھی۔ تند خو اور خونخوار مگرمچھوں میں گھرا ہوا فلسفی غور کر رہا تھا کہ زندگی کو ایک حقیر مجبوری سے ایک بیش بہا قوت میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسی سوچ میں اچانک اس کے احساس کو ایک واضح شکل مل گئی۔ وہ

یہ کہ زندگی ایک عطیہ ہے جس کا کم از کم حق ادا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ دوسروں کو اس میں حصہ دار بنایا جائے۔" جناب رئیس احمد مرحوم نے اپنے کتابت کے ہنر کو اس رسالے کی صورت میں ایک بیش بہا زندگی اور قوت میں تبدیل کر دیا تھا

۔

اللہ تعالی کے حضور میں بصد خوب خلوص دعا گو ہوں کہ مرحوم کی روح کو اپنی برکتوں کے جلو میں رکھے۔ان کے لواحقین کے لئے بھی اچھی خواہشات اور نیک تمناؤں کی دعا ہے۔ آمین -- یارب العالمین

! اللہ بھی کن کن ہستیوں سے کیسے کیسے کام لیتا ہے

میرا اور ان کا جنم جنم سے ساتھ تو نہیں ہے - البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی تھی - جب میری داڑھی بھی نہیں آئی تھی- یہ وہ زمانہ تھا جب میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور نیا نیا پڑھنے گیا تھا اور ہوسٹل میں قیام پذیر تھا- یہ واقفیت پچھلے پچاس سال سے برقرار ہے- لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ داڑھی وغیرہ رکھ لی ہے حالانکہ یہ تو کہتے رہتے ہیں -

یہ ہے میری اور رائے ونڈ کی تبلیغی جماعت کی رفاقت کی بات - انکی باتیں سننے کبھی بیٹھ جاتا ہوں- کبھی ان کے ساتھ چل بھی پڑتا ہوں - البتہ بیرون ملک سے جب ان کے افراد آتے ہیں تو ان کی آمد پر ذرا زیادہ ہی متحرک ہو جاتا ہوں -

ابھی پچھلے ماہ ہی جاپان سے کچھ افراد آئے تھے - ان میں ایک لڑکا بھی تھا- عمر بیس بائیس برس کے قریب- پتہ چلا کہ اس نے مذہب اسلام قبول کیا ہے- اس کے پاس ایک قران مجید تھا- اس کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا گیا تھا -

ابھی اس ملاقات کو گزرے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ پتہ چلا کہ فی جی سے جماعت آئی ہوئی ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ میں کمزور ہونے کے سبب پتہ ہی نہیں تھا کہ فی جی کس چڑیا کا نام ہے۔ کہاں واقع ہے۔اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔ کسی نے ایسے ہی چلتے پھرتے بتایا کی آسٹریلیا کے قریب کچھ جزائر ہیں انہیں فی جی کہتے ہیں۔ خیر میں ترنت مسجد پہنچ گیا۔ نماز کے بعد اعلان ہوا کہ یہ حضرات دنیا کے ایک دور دراز کونے سے آئے ہیں۔ بیس گھنٹے کی مسافت ہے۔ نماز کے بعد انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ افراد کن سے ملتے جلتے ہیں۔ کبھی اوبامہ سے ملتے جلتے نظر آئے اور کبھی اپنے ممبئ مدراس کے لوگوں رنگ ان میں نظر آیا۔ کبھی ملباریوں سے مشابہت نظر آئی۔ لیکن تقریر سن کر تو مزید دنگ رہ گیا۔ وہ اردو میں تقریر کر رہے تھے اور ان کی اردو۔۔ ان کی اردو۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔۔ ان کی اردو کس سے ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ۔۔ کہاں سنی ہے ایسی اردو۔ کون سی فلم تھی جس میں یہ زبان بولی جا رہی تھی۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ کچھ افراد کو اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھا۔ میں خیالات سے باہر آیا۔ پتہ چلا کہ ان افراد کی ایک فہرست بنائی گئی ہے جو تبلیغ کے اس کام میں شرکت کریں گے۔ فی جی کے ہی ایک صاحب نام دہرا رہے تھے۔ یہ خادر محی الدین صاحب ہیں۔ اگلے ماہ سے چلے پر جا رہے ہیں۔ یعنی چالیس دن کے لئے تبلیغ کے کام پر نکلیں گے۔ پھر ایک دوسرا نام پکارا کہ یہ خدوس خان صاحب ہیں ان کا

بیرون ملک جانے کا ارادہ ہے۔ میں چونک پڑا۔ یہ "ق" کو کس انداز میں کہہ رہے ہیں یعنی "خاف" یہ حیدر آباد دکن بھارت کا لہجہ ؟ ان کا ان سے کیا تعلق ؟۔ ان کا بیان ختم ہوا۔ اس کے بعد جماعتیں تشکیل دی گئیں کہ مقامی لوگوں سے ملا جائے ۔ یہ سب باتیں مجھے تو حیران کئے جا رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ فی جی سے تقریباً اسی کے قریب افراد آئے ہیں اور ہماری مسجد میں پانچ افراد کی تشکیل ہوئی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ان کے کوئی رشتے دار وغیرہ بھارت پاکستان میں نہیں رہتے ہیں۔ نیز وہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔

فی جی کی داستان بھی عجب حیرت انگیز ہے۔ اور اتنے دور دراز علاقے میں اسلام پھیلنے کی داستان اس سے زیادہ حیرت انگیز۔ اللہ بھی کن کن ہستیوں سے کیسے کیسے کام لیتا ہے ' یہ سوچ کر دانتوں میں انگلی داب لیتا ہوں۔ یہ دور دراز دنیا سے الگ تھلگ علاقہ جہاں پہنچنے کا زمین راستہ ہی نہیں تھا۔ وہاں اللہ نے برطانیہ کے انگریزوں کو چنا کہ تم یہاں کلمہ لاالہ الااللہ محمد ارسول اللہ کی آواز پہنچاؤگے اور انہوں نے یہ آواز پہنچائی ۔

یہ 1874 کی بات ہے۔ پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوئے 17 برس ہو

چکے تھے۔ دنیا میں ہر طرف برطانیہ کے پرچم لہرا رہے تھے۔ برطانوی مقبوضہ علاقوں کی وسعت بڑھتی جارہی تھی۔ اور وہ دنیا کے دوسرے علاقوں پر بھی قابض ہوتے جارہے تھے۔ براعظم یورپ میں بیٹھے ہوئے ان کی نظر براعظم آسٹریلیا پر پڑی بلکہ آسٹریلیا سے کے بھی دور پار فی جی پر پڑی جو امریکہ کے زیر انتظام تھا۔ برطانوی دماغ مختلف حکمت عملیوں سے اسے بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ کامیاب کیا ہوئے ' بلکہ فیجی کا سربراہ "کیکو باؤ" خود ہی برطانیہ پہنچا اور درخواست کی کہ فیجی کے باشندوں پر دست شفقت پھیرتے ہوئے اپنی سرپرستی میں لے لیجئے اور ہمارے قرضے چکا کر مملکت امریکہ سے جان چھڑا دیجئے۔ اور یوں وہ بھی برطانوی پرچم کے زیرِ نگیں آگیا۔ برطانوی افراد میں ایک خوبی ضرور تھی کہ وہ قابض ہونے کے بعد مقبوضہ علاقے میں اپنے مفادات مد نظر رکھتے ہوئے ترقیاتی کام کرتے تھے۔ سو یہی ارادہ انھوں نے فی جی میں کیا۔انہیں فی جی میں گنے کی کاشت اور اسکے بعد اسے شوگر (چینی یعنی شکر) میں تبدیل کرنے کے وسیع امکانات نظر آئے۔ اس کام کے لئے انہیں افرادی قوت کی ضرورت پڑی۔ ایسی افرادی قوت جو سمندروں کی موجوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرسکیں۔ جو ایک مرتبہ اپنے کام میں جت جائیں تو اسے پایہ تکمیل کو پہنچائے بغیر سر نہ اٹھائیں۔ اپنے کام سے مطلب رکھیں۔ وہ منکسر المزاجی کا کامل نمونہ ہوں۔ زرعی امور سے پوری طرح واقف ہوں۔ ۔ انہیں یہ افراد فوری طور پر مدراس۔ ۔ حیدرآباد دکن کلکتہ میں نظر آئے

برطانیہ نے انہیں فی جی کے لئے پانچ سالہ لازمی قیام کے معاہدے کے تحت بطور مزدور بھرتی کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ کچھ افراد پنجاب، بلوچستان، خیبر پختونخوا اور بلوچستان سے بھی لئے۔اس وقت تک بھاپ کے بحری جہاز یورپی اقوام کی محنت و تحقیق کے سبب عالم وجود میں آچکے تھے۔ یہ مزدور جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے بھاپ چھوڑتے جہازوں میں بیٹھ کر دس ہزار کلومیٹر کی مسافت پر واقع فیجی پہنچنے لگے۔ اس زمانے میں یہ تقریباً چالیس دن کا سفر ہوتا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب اس جہاں آب و گل میں دینِ اسلام کی روشنی پھیلے ساڑھے بارہ سو برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ لیکن فی جی کے جزائر اس روشنی سے ابھی تک محروم تھے۔ اب یہ جزائر اسلام کی ضیاء پاشیوں سے منور ہونے جا رہے تھے۔ بدھ خان پہلا مسلماں تھا جس نے جہاز سے اترنے کے بعد شکرانے کی نماز کی اذان دی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر۔

اشہد ان لاالہ الا اللہ۔ اشہد ان لاالہ الا اللہ

اشہد ان محمدا رسول اللہ۔ اشہد ان محمدا رسول اللہ

آللہ کی کبیریت ماننے کا اقرار اور محمد کو رسول تسلیم کرنے کا اظہار کلمہ شہادت کی صورت میں اس علاقے سے ہم کنار ہوا۔ فی جی کی فضاؤں نے۔ فی جی کی ہواؤں نے۔ ہرے بھرے درختوں نے۔ آسمان پر اڑے پرندوں نے یہ صدا سنی اور ایک نئے سکون قرار، اطمینان کی لہروں میں کھو سے گئے۔ فی جی کی سرزمین پر پہلی مرتبہ اللہ کے، بندوں کے ' اللہ کے حضور میں جھکے سر دیکھ کر نیلا آسمان اور اس پر تیرتے ہوئے بادل بھی نیچے جھک آئے۔

یہ معاہدہ بعد میں جانے والے افراد اور انگریزی حکومت کے باہمی رضامندی سے مزید پانچ سال بڑھا دیا گیا تھا۔ دس سال بعد انگریزی حکومت نے انہیں مستقل رہائش کی پیش کش کی اور یہ بھی کہا کہ کسی بھی جزیرے میں آباد ہو سکتے ہیں۔

نئے علاقوں میں جا کر بسنے میں کئی مسائل پیش آتے ہیں۔ سو وہ یہاں بھی آئے۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے لحاظ سے بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے وہ ایک معاہدے کے تحت ائے تھے چنانچہ نماز کی ادائیگیوں میں کوتاہی سے وہ پریشان ہوئے اور پھر رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کے مسائل بھی کھڑے ہوئے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کی اسلامی مسائل کے حل کے لئے کوئی

رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ آبادی کم تھی اس کے سبب شادی کے لئے مناسب رشتے ملنے بھی آسان نہیں تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بھی شادی کے رشتے طے ہو جاتے تھے۔

نئے علاقوں میں جا کر بسنے میں کئی مسائل پیش آتے ہیں۔ سو وہ یہاں بھی آئے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے مذہب کے لحاظ سے بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ظاہر ہے وہ ایک معاہدے کے تحت ائے تھے چنانچہ نماز کی ادائیگیوں میں کوتاہی سے وہ پریشان ہوئے اور پھر رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کے مسائل بھی کھڑے ہوئے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کی اسلامی مسائل کے حل کے لئے کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔

آبادی کم تھی اس کے سبب شادی کے لئے مناسب رشتے ملنے بھی آسان نہیں تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بھی شادی کے رشتے کافی تعداد میں ہوئے۔ متحدہ ہندوستان سے آنے والے افراد نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے مسائل باہمی طور پر حل کر کے مشکلات کا مقابلہ کرینگے اور ہندو مسلم رشتے باہمی طے ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں کو منانے میں بھی تعاون کرتے تھے۔ محرم کے مہینے میں تعزیئے بنانے میں ہندو مسلم دونوں آگے اگے ہوتے تھے اور انہیں بحر الکاہل میں لے جا کر ٹھنڈا کرنے کے لئے اکٹھے جایا کرتے تھے۔

آج 137 برس بیت چکے ہیں۔ وہ مسلمان جو یہاں مزدور کی حیثیت سے آئے تھے ان کی ذریت تعلیم کے ذریعے اب یہاں کلیدی عہدوں پر فائز ہے مثلاً۔ اٹارنی جنرل۔ وزیر قانون۔ وزیر صنعت۔ وزارت صنعت کے سیکرٹری۔ محکمہ رسل و رسائل یعنی ۔ میڈیا ڈپارٹمنٹ کے سربراہ

اس کے علاوہ سڑکوں / مقامات کے نام بھی اہم مسلمان شخصیتوں کے نام پر رکھے گئے ۔ ہیں مثلاً مقبول روڈ۔ غازی روڈ۔ شالیمار سینٹر وغیرہ

فیجی کے یہ مسلمان اردو ایک خاص لہجے میں بولتے ہیں لیکن ان کی بنیاد یا اصل ماخذ اردو ۔ ہی ہے۔ جیسے ہمارے یہاں اردو مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے

تبلیغی جماعت کے ارکان اور فیس بک پر فی جی کے افراد سے بات چیت کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان اگرچہ وہاں پر اقلیت میں ہیں لیکن ایک اچھے نظام حکومت کے تحت وہ نہایت پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک اچھا معاشرہ گل و بلبل کی خوشبوؤں اور نغموں کے ساتھ پنپتا جا رہا ہے۔ اسلام بھی اپنی پوری عظمت و حشمت اور آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے مسلمان نہ کسی

سے مرعوب ہیں اور نہ ہی کسی کے مغلوب۔ گلے میں مظلومی کے طوق نہیں ہیں بلکہ شادمانی و شادابی کے پھول ہیں۔ رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر پورے ملک فیوجی میں عام تعطیل ہوتی ہے۔ ریڈیو ٹی وی سے خصوصی پروگرام نشر کیئے جاتے ہیں۔ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے موقع پر تمام مسلمانوں کو سرکاری طور پر چھٹی دی جاتی ہے اور اپنے مذہبی رسومات کی ادائیگی میں کسی قسم کی قدغن نہیں۔ گائے کی قربانی کا کوئی مسئلہ نہیں۔

فی جی میں زیادہ تر اسکول پرائیویٹ سوسائٹیوں، رفاہی اداروں، مختلف تنظیموں کے تحت چلتے ہیں۔ ان اسکولوں کا نظام تعلیم اور نصاب سیکولر اصولوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے حکومت ان کے تعلیمی نظام اور نظم و نسق کا جائزہ لیتی رہتی ہے اور ان کا سلیبس متعین کرنے میں تعاون کرتی ہے۔ مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کی زیر نگرانی 22 اسکول اور 8 کالج چل رہے ہیں۔ ان مسلمانوں کے اسکولوں کا نتیجہ مختلف بیرونی امتحانات میں جو کہ حکومت کے تحت ہوتے ہیں 1 ی سے سو فیصد تک ہوتا ہے۔ اسی سبب سے غیر مسلم طلباء و طالبات بھی ان اسکولوں میں داخل ہونا پسند کرتے ہیں بلکہ کئی اسکولوں میں تو غیر مسلم اسٹوڈنٹس کی تعداد زیادہ ہے۔

مسلم تنظیموں کی زیر نگرانی جو اسکول چل رہے ہیں وہاں قرآن ناظرہ کے علاوہ اسلامک اسٹڈیزاور اردو عربی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ تعلیم کے لئے کالج کے بچوں کو بلا سود قرضے دینے کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ انہی تنظیموں کے تحت بچوں کے لئے رہائشی یعنی ہوسٹل کی سہولت والے کالج بھی کھولے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے سبب کلیدی ذمہ داریوں والی نوکریاں کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہے۔

اس نظام تعلیم کے علاوہ مسلمانوں نے اپنا ایک مدرسے کی تعلیم کا نطام بھی بنایا ہوا ہے۔ جہاں فقہ ' حفظ منطق وغیرہ کے اسلامی کورس کروائے جاتے ہیں۔ البتہ ان مدرسوں کو حکومت کی طرف سے کوئی مدد نہیں فراہم کی جاتی ہے۔

تبلیغی جماعت کے ایک فرد نے کہا کہ ہم جب بھارت پاکستان میں ہندو مسلم تنازعے سنتے ہیں تو بہت حیرت ہوتی ہے کیونکہ فی جی میں تو ایسے کوئی مسائل نہیں ہیں اور سب ملکر شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے جنازے میں مسلمان کم ہوتے ہیں اور ہندو زیادہ۔

انہوں نے مزید کہا کہ رمضان کے موقع پر دوسرے مذاہب کے پیروکار ہمارا خیال کرتے ہوئے کچھ اپنے طور پر سہولتیں دے دیتے ہیں۔

ایک بات کا میں نے یہ اندازہ لگایا کہ فیجی کی عوام چین کے بڑھتے ہوئے اثر سے کچھ خوفزدہ ہیں۔ چینیوں کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ ان کا اپنا رہنے کا انداز ہے جو کہ فیجی کی عوام سے مختلف ہے۔ چینی افراد فی جی کے متمول طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔

فی جی بحر الکاہل کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ 322 جزائر پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں صرف 100 کے قریب جزیرے ہیں جن میں آبادی ہے۔ اس کی آبادی 9 لاکھ کے قریب ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد 70 ہزار کے قریب ہے۔

اسلام کی اس خطے میں آمد سے قبل سن 1830 میں ایک عیسائی مشنری دستے نے یہاں آکر اپنے مذہب سے یہاں کے لوگوں کو آشنا کرایا تھا اور مقامی آبادی اس مذہب کی پیروی کرتی تھی۔

(اس مضمون کی تیاری میں، میں فی جی کے سماجی رہنما جناب محمد شمیم علی کا بہت شکر گزار ہوں۔ جن سے میرا تعارف انٹرنیٹ کے ذریعے ہوا اور وہ بھرپور معاونت کرتے رہے۔ ان کے بغیر اس کی تکمیل ناممکن تھی)

یہ انعام گھر--یہ قرعہ اندازیاں

محترمہ رئیس فاطمہ اپنے کالم "سالانہ فوڈ فیسٹیول " مطبوعہ 19 جون 2016 - روزنامہ ایکسپریس کراچی میں ٹیلی وژن پر رمضان المبارک میں ہونے والے انعام گھروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ مائیک ہاتھ میں لئے ٹی وی کے میزبان ایک طرف سے دوسری طرف اچھل کود کرتے ہوئے جاتے ہیں - ایک سوال کے جواب میں کئی کئی ہاتھ بلند ہوتے ہیں- اللہ کی پناہ ! جیسے سارا شہر بھکاری بن گیا ہے- لمبے لمبے ہاتھ کرکے لہرائے جاتے ہیں- میزبان کے کان میں لگا مائیک میزبان کو مسلسل ہدایات دیتا رہتا ہے کہ کس کو انعام دینا ہے اور کس سے سوال پوچھنا ہے- اس لئے بعض اوقات اشارے بھی دئے جاتے ہیں کہ وہ صحیح جواب دے دے

اس پر مجھے اپنے ایک کزن کا ایک بیٹا یاد آگیا

بیس سال پہلے کی بات ہے

میرے ایک کزن کا بیٹا ارسلان ' ایک سامان منتقل (شفٹ) کرنے والے ادارے - میں ملازم ہوگیا- یہ ملازمت کسی کے ریفرینس سے ملی تھی

ارسلان اگلے دن نوکری جوائن کرنے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اس کے لئے ایک کمرہ پہلے سے ہی صاف ستھرا کرکے نام کی تختی دروازے پر آویزاں کر دی گئی تھی نیز میز پر اس کے نام کے وزٹنگ کارڈ بھی پہلے سے چھاپ کر دو

- پیکٹوں میں رکھ دئے گئے تھے

خیر ملازمت کا آغاز ہوا۔ مختلف امور دیکھتے ہوئے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ اس دوران درمیان میں کسی گھر میں بھی جا کر کام کا جائزہ لینے کو کہا گیا تھا۔ اس گھر کے رہائشی کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنا سامان شفٹ کرنے کے لئے اس ادارے کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس طرح کے کام کرتے کرتے شام ہو گئی اور - چھٹی کا وقت ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹہ رہ گیا

کمپنی کے مالک نے ارسلان کو بلایا اور اس روز کے کام کاج کے بارے میں ضمناً تبصرے کئے۔ اس کے بعد اپنے اصل موضوع پر آیا۔ ارسلان سے اس کے ماموں کا تذکرہ کیا۔ جو ایک بہت ہی بڑی ملٹی نیشنل فرم میں ڈائرکٹر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ کہا تمہیں یہاں ملازمت دینے کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ماموں سے ہمیں کچھ ٹھیکے دلاؤ ارسلان حیران رہ گیا۔ اس نے کہا " سر! اگر آپ کو اپنے ماموں سے ٹھیکے دلانے "ہوتے تو میں کہہ کر ان ہی کے ادارے میں ملازم نہ ہو جاتا --- یہ کام نہیں ہو سکتا -کچھ نرم گرم باتیں ہوئیں اور ارسلان نوکری چھوڑ کر نکل آیا

نکلتے نکلتے اس نے اپنے وزٹنگ کارڈ کے دو پیکٹ ایسی ہی خالی الذہنی کی حالت میں اٹھا لئے۔ ان پیکٹوں میں سو کے قریب کارڈ تھے۔ آفس کی عمارت کے باہر

آکر ارسلان سوچنے لگا اب کیا کروں۔ ذہن میں تھوڑی سی تلخی اب تک تھی۔ پہلے سینما جانے کا خیال آیا لیکن اس کا وقت نکل چکا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ کسی مقامی ہوٹل میں ایک ادارے کی طرف سے کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اپنا وقت کاٹنے کے لئے ارسلان وہاں چلا گیا۔ وہاں اس ادارے کی سالگرہ منائی جارہی تھی۔ اسٹیج پر مختلف عہدوں کے ملازمین آکر ادارے کی مدح خوانی کر رہے تھے۔ کچھ ملازمین چیف ایگزیکٹیو کی محنت اور ایمانداری کا تذکرہ کر رہے تھے۔ پھر اسٹیج سیکرٹری آئے۔ ہنستے مسکراتے لہجے میں ایک دو باتیں کیں اور اعلان کیا کہ اپنے وزٹنگ کارڈ ایک ڈبے میں ڈالدیں۔ لکی ڈرا ہوگی۔ قرعہ اندازی کی جائے گی۔ خوش نصیب افراد کو انعامات دئے جائیں گے۔ ارسلان کو اچانک اپنے وزٹنگ کارڈ یاد آگئے۔ وہ اب اس کے لئے بے کار تھے۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ انہی منتشر خیالات کے ساتھ ارسلان نے اپنے کارڈ ایک ایک کرکے اس قرعہ اندازی کے ڈبے میں ڈال دئے۔ یہ فعل صحیح تھا یا غلط، اس وقت کچھ دماغ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ البتہ ارسلان نے اندازہ لگایا کہ حاضرین نے اس لکی ڈرا کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

ایک گھنٹے بعد وہ ڈبہ حاضرین کے سامنے لایا گیا۔ قرعہ اندازی شروع ہونے والی تھی۔ اب مائیک ادارے کے کسی اہل کار نے سنبھال لیا تھا۔ موسیقی اپنے پورے عروج پر تھی۔ اسٹیج پر رنگ برنگی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ قرعہ

اندازی کے ڈبے کو خوب ہلایا گیا اور ایک کارڈ نکالا گیا۔ کارڈ نکالنے والے کی زور دار آواز بلند ہوئی اس کے ساتھ ہی موسیقی کی ایک دھماکہ دار آواز گونجی "یہ رہا پہلا انعام کسی سرکاری ادارے کے ایک افسر کا نام مع عہدے کے پکارا گیا۔ ارسلان حیران رہ " گیا۔ ارسلان نے دیکھا تھا کہ اعلان کرنے والے کے ہاتھ میں کارڈ اس کا تھا اور نام کسی اور کا پکارا جا رہا تھا ۔ ارسلان اس وقت ایک عجیب کیفیت میں تھا۔ اس لئے اسے یہ بات باعث حیرت نہیں لگی نہ ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی جا رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سارے کارڈ ڈالکر اس نے بھی تو کوئی احسن کام نہیں کیا تھا البتہ اسٹیج پر جو ناٹک کیا رچایا جا رہا تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ خباثت ایک نئے روپ۔ میں جلوہ گر تھی۔ ارسلان کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔اسے تو اس وقت ماضی کا پسندیدہ گانا بھی یاد نہیں آیا جو ایسی صورت حال میں اس کے منہ سے بے ساختہ نکل جایا کرتا تھا

جانے کیسا سفر ہے میرا----- جہاں ہے منزل وہیں لٹیرا

۔ کئی سال گزر گئے۔ ارسلان دوبئی جا کر سیٹ ہو گیا۔ شادی بھی ہو گئی

ایک مرتبہ پاکستان آیا تو پکنک کے لئے سسرال والوں کے ساتھ کسی فارم ہاؤس گیا۔ وہاں سسر کے خالو زاد بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت مختلف ٹولیوں میں لوگ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ والدین بچوں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے کہ بچے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کردیں۔ بچے سب سے بے پرواہ

ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ کیلوں کے جھنڈ کے پاس سسر اور کچھ دوسرے خاندان کے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ارسلان بھی وہاں جا بیٹھا۔ ادہر ادہر کی ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس طرح کے انعامات کی تقسیم کی بات بھی آئی

۔ ارسلان نے ایسے ہی اپنے اس واقعے کا تذکرہ کر دیا ۔

۔ سسر کے خالہ زاد بھائی ایک دم چونک گئے

ایک دم مختلف سوالات کئے۔ کہاں ہوا تھا وہ فنکشن ؟۔ کس نے کرایا تھا فنکشن وغیرہ وغیرہ۔۔ پھر کہا کہ ارے ارے اس میں تو میں بھی تھا۔ مجھے بھی انعام دیا گیا تھا۔

۔ حالانکہ میں نے تو اپنا کارڈ بھی نہیں ڈالا تھا

پتہ چلا کہ سسر کے خالہ زاد بھائی ایسے محکمے میں افسر تھے جہاں اس ادارے کو ان سے

۔ واسطہ پڑتا رہتا تھا

ڈرامہ 'دعئ چلو' کی پہلی اینٹ --- ریاض بٹالوی مرحوم

اعلان ہوا کہ اے لاہور والو۔ تم مجھے بخوبی جانتے ہو۔ ہر روز میری تصویر بھی پاکستان کے بہتریں اخبار میں دیکھتے ہو۔ تو اب تمہاری مجرم شناسی کا امتحان ہوتا ہے۔ میں لاہور میں چلتا پھرتا رہوں گا۔ تم نے مجھے پکڑنا ہے۔ جو مجھے پکڑے گا ایک اچھی خاصی رقم بطور انعام کا حقدار بھی ہو گا۔

یہ اعلان ہوا تھا پاکستان میں صحافت کو ایک نیا انداز دینے والے اخبار "مشرق" لاہور کے معروف فیچر نگار ریاض بٹالوی کی جانب سے۔ زمانہ تھا 1960 - 1965 کا۔ اور اس کے بعد ریاض بٹالوی لاہور میں غائب ہو گئے۔ بات یہی ختم نہیں ہوئی۔ وہ ہر روز کی روداد بھی لکھنے لگے کہ کہاں کہاں پھرے۔ کس کس سے ملاقات کی۔ کس کس جگہ انکی تصویر بھی کھینچی گئی۔ اور لوگ سر پیٹ لیتے تھے کہ "یار وہ تو میرے قریب ہی سے نکلا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا" ایک روز وہ اس زمانے کے صوبائی وزیر مسعود صادق کی رہائش گاہ کے قریب سے بھی گزرے۔ وہاں قریب کھڑے لوگوں سے بات چیت بھی کی۔ انکی خفیہ کیمرے سے تصویر بھی کھینچی گئی۔ لیکن کسی کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلا کہ بات چیت کرنے والا فرد کوئی اور نہیں بلکہ ریاض بٹالوی ہے۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن۔

ریاض بٹالوی لاہور میں مختلف روپ دھارے پھرتے رہے۔ کبھی دیہاتی لباس میں۔ کبھی انگریزی پیراہن میں۔ کبھی سیدھے سادے کپڑوں میں۔ لوگوں کی دلچسپی اور ناکامی دیکھتے ہوئے لاہور کے کچھ اور اداروں نے بھی ان کو پکڑنے پر انعام کا اعلان کردیا۔ اخبار مشرق خریدنے کے بعد اب لوگ خبریں بعد میں پڑھتے اور ان کی مٹر گشت کا احوال پہلے پڑھتے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا سا مزہ آنے لگا تھا۔ مشرق اخبار کا یہ اقدام لوگوں کو ایک سبق بھی دے رہا تھا کہ وہ کس قدر اپنے ارد گرد سے بے خبر ہیں۔

اس طرح تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز پورا دن گزر گیا اور رات کو نو بجے پکڑے گئے لیکن وہ بھی کیمرے والے کی غلطی کے سبب، ورنہ ان کا پکڑا جانا اس وقت بھی مشکل تھا۔ ریاض بٹالوی پلازہ سینما چھ سے نو بجے والا شو دیکھنے گئے۔ ٹکٹ بھی لیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ لوگوں کی بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے سینما ہال کے گیٹ پر پہنچ کر ٹکٹ بھی کٹوایا۔ کسی کو علم نہیں ہوا۔ سینما ہال میں جا کر اپنی نشست پر بیٹھ کر آرام و اطمینان سے فلم سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ فلم کا انٹرول بھی ہوا۔ ہال کے اندر سب روشنیاں روشن کر دی گئیں لیکن ریاض بٹالوی کو کوئی نہیں پہچان سکا۔ فلم کا اختتام نو بجے شب کو ہوا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ مشرق کے فوٹو گرافر نے اس وقت ان کی تصویر کھینچی۔ روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔

۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے ایک فرد کے دماغ میں بھی ایک روشنی کوندی

---- اس وقت تصویر ؟---- کیوں ؟

ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے کہ تصویر لی جائے ؟ اس زمانے میں کیمرے اتنے ہی نایاب تھے جتنے آج کل بجلی کے ریڈیو۔ ان صاحب نے اِدھر اُدھر ، آگے پیچھے ، دائیں بائیں ، افراد کا جائزہ لینا شروع کیا اور آخر کار ریاض بٹالوی کو دریافت کر ہی لیا۔

۔ کیمرہ مین اس وقت تصویر نہیں کھینچتے تو اس وقت بھی ریاض بٹالوی نہیں پکڑے جاتے

ریاض بٹالوی کا تعلق گجرات پاکستان سے تھا۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن صحافت سے بہت لگاؤ تھا۔

یہی لگاؤ انہیں لاہور کھینچ لایا اور انھوں نے نسیم حجازی کے اخبار 'کوہستان' میں شمولیت اختیار کی۔

۔ پھر جب 'مشرق' لاہور کا اجرا ہوا تو اس میں چلے آئے

میں اس زمانے میں کوئٹہ میں رہتا تھا۔ اس دور میں کوئٹہ کے مقامی اخباروں کا وہ معیار نہیں تھا جو کہ لاہور یا کراچی کے اخبارات کا تھا۔ اس لحاظ سے کوئٹہ میں دونوں شہروں کے اخبار آیا کرتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ

مشرق لاہور کا جو معیار تھا وہ دوسرے اخباروں کو نصیب نہیں تھا۔ اس میں مشرق کے عنایت اللہ کی کوششوں کا بہت دخل تھا۔ عنایت اللہ صاحب نئے نئے خیالات لے کر آتے اور اپنے اخبار میں انکا عملی تجربہ کرتے جس سے نہ صرف ان کے اخبار کی ظاہری شکل و شباہت میں نکھار آتا اور وہ دیدہ زیب لگتا تھا بلکہ اس کے اندر شائع شدہ مواد بھی لوگوں کی توجہ کھینچتا۔ ریاض بٹالوی کے شہر میں پوشیدہ طریقے سے چھپنے کا خیال بھی جناب عنایت اللہ کے ذہن رسا کی پیداوار تھا جسے ریاض بٹالوی نے نہایت ہی کامیابی سے نبھایا۔ ریاض بٹالوی کے تحریر شدہ فیچر اخبار "مشرق' کی جان ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے معاشرے کے مختلف النوع سلگتے موضوعات پر لکھا اور کئی چھپے ہوئے سنسنی خیز گوشے بے نقاب کئے۔ ان کے تحریر کردہ فیچر بلاشبہ قارئین کو سوچ کو نئی جہتیں اور نئے زاویئے عطا کرتے تھے۔

انہوں نے اس زمانے میں اپنے اخبار میں صحافت کا جو نیا رنگ دکھایا تھا کوئی اخبار سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

فیچر کی تیاری کے دوران انہیں لوگوں کے انفرادی مسائل سے بھی آشنائی ہوتی اور وہ انہیں حل کرنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتے تھے۔ یوں وہ فیچر رائٹر کے ساتھ ساتھ ایک سوشل ورکر بھی بن گئے۔ بقول روزنامہ خبریں کے چیف

ایگزیکٹیو جناب ضیا شاہد کے دفتر میں ان کے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں سماج کا بھلا چاہتے تھے۔

یہ تھیں میری وہ یادیں جو بچپن اور لڑکپن سے ہی میرے دل میں ریاض بٹالوی مرحوم کے لئے پسندیدگی اور انسیت کا باعث بنی تھیں۔

ان سے میری پہلی ملاقات ان کے نسبت روڈ لاہور کے دفتر میں ہوئی تھی۔ سال غالباً 1969 تھا۔ سیڑھیوں کے پاس ہی چھوٹا سا کمرہ ان کا آفس تھا۔ میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے چند مسائل تھے۔ انکا حلاوت بھرا لہجہ، محبت آمیز برتاؤ دیکھ کر میں چند لحظوں کے لئے بھول ہی گیا کہ مں کسی مسئلے سے دو چار ہوں۔ وہ نہایت شائستگی سے مجھے ملے۔ وہ میرے لئے بلاشبہ ٹھنڈی چھاؤں اور ٹھنڈے موسم کا استعارہ ثابت ہوئے۔ اور انھوں نے میرا مسئلہ حل کرانے میں میری مدد کی۔

لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ میں تو اس ملاقات سے پہلے ہی مشرق میں ان کے چھپنے والے فیچر پڑھ کر گرویدہ تھا۔ ایک میں ہی نہیں اور بھی لوگ اس عظیم فیچر نگار سے متاثر تھے۔ پاکستان ٹی وی اس زمانے میں پاکستان کا واحد ٹی وی چینل تھا اور وہ اپنے عروج پر تھا۔ وہ بھی پاکستانی معاشرے کی بنت و

ساخت پر مشتمل ڈرامے پیش کرنے کے لئے اچھی سے اچھی کہانیوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وارث 'خدا کی بستی' تعلیم بالغان وغیرہ اسی پی ٹی وی نے پیش کئے تھے۔ پی ٹی وی کی جوہر شناس نگاہوں نے بھی ریاض بٹالوی کی صلاحیتوں کو پہچان لیا اور ان کے فیچروں کی بنیاد پر ہی اس زمانے کی ٹی وی سیریل "ایک محبت سو افسانے" میں کئی ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان کے ایک فیچر سے اخذ کئے گئے ڈرامے "دبئی چلو" نے تو ایک دھوم ہی مچادی اور ان کا نام شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ اس میں اگر اداکار علی اعجاز کی اداکاری پورے کا پورا نیچرل رنگ لئے نہ ہوتی تو یہ ڈرامہ مقبولیت کے گراف میں اونچا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی تسلیم کہ اگر ہدایت کار نے اپنی ساری کی ساری صلاحیتیں اس ڈرامے کی تخلیق کے دوران نہیں انڈیلی ہوتیں تو یہ ڈرامہ لوگوں کی توجہ کھینچنے میں ناکام ہو جاتا لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اگر ریاض بٹالوی دبئی جانے والے افراد کے مسائل ' گہری نظر سے تجزیے نہیں کئے ہوتے ' بد عنوانیوں کے مختلف مافیا اور گونگے مظلوم لوگوں کی عمر بھر کی کمائی لوٹنے والے پتھر دل ایجنٹوں کے بیچ میں گھس کر حقائق سے پردے نہ اٹھائے ہوتے تو سب کچھ اکارت ہو کر رہ جاتا۔ یہ ریاض بٹالوی کے ہی قلم کا کمال تھا جو جزئیات کو بھی ایک وسیع تناظر میں لایا اور لوگوں کے دلوں پر دستک دینے میں کامیابی حاصل کی ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامہ 'دبئی چلو' کی۔

۔ پہلی اینٹ ریاض بٹالوی نے رکھی

یہ سب کچھ ٹی وی پر پہلی مرتبہ دکھاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے تو خود پاکستان ٹی وی کے افسران بھی دہل

سے گئے کہ انہیں دکھایا جائے یا نہیں۔ پاکستان ٹی وی کے عارف وقار جو اس ڈرامے سے منسلک تھے کہتے ہیں کہ دوبئ چلو' نشر ہونے سے چار گھنٹے قبل اس پر ایک قسم کی پابندی لگ گئی تھی۔ لاہور اسٹیشن کے پروگرامز منیجر نے اس کے تین مناظر پر اعتراض کیا جن میں ان کے بقول سرکاری محکموں پر تنقید کی گئ تھی۔ انہیں خاص طور پر پاسپورٹ آفس کے مناظر پر اعتراض تھا جہاں بھولے بھالے لوگوں کو پھانسنے والے ٹاؤٹ پھرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ رات نو بجے ڈرامے کو نشر کرنا تھا لیکن آٹھ بجے تک سینسر نے اسے پاس نہیں کیا تھا۔ کہا گیا کہ پاسپورٹ آفس کے مناظر خارج کر دئے جائیں۔ آخر ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ایک بیان پر دستخط کرائے گئے کہ اگر حکومت کو اس کھیل کے کسی منظر پر اعتراض ہوا تو میں اس کی ذمہ داری جناب عارف وقار پر ہوگی ۔۔۔اور

۔ یوں رات نو بجے اپنے مقررہ وقت پر 'دوبئ چلو' کی نمائش ممکن ہوئی

حکومت پاکستان نے جناب ریاض بٹالوی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے 1986

۔ میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا

میں اب جبکہ انجینئرنگ کرکے اور پینتیس سال نوکری کے نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد ریٹائر ہو چکا ہوں تو میں اب بھی اپنے آپ کو ان کے زیر احسان پاتا ہوں۔ دل میں بڑی خواہش اٹھتی تھی کہ ان کے بارے میں کسی سے معلوم کروں لیکن کہیں بھی تو ان کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا

آج ایسے ہی گوگل سرچ کی تو پتہ چلا کہ اب وہ اللہ تعالی کے یہاں جا چکے ہیں۔ اللہ تعالی سے دعاگو ہوں کہ اے اللہ ان کی بشری کمزوریوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جنت میں ان کے لئے رحمت کے دروازے کھول دے اور اپنی برکتوں سے مالامال کر۔ آمین -- - یارب العالمین

----- اولمپک کھیل ، برازیل کے سینکڑوں ارمان

میر درد کی غزل کی زمین پر لکھے ہوئے اشعار میں یہ شعر مجھے ہمیشہ افسردگی کی گہرائیوں میں لے جاتا تھا ۔

سینکڑوں ارمان لیکر آئے تھے ۔ دل میں لاکھوں حسرتیں لے کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ۔ہم تو اس جینے کا ہاتھوں مر چلے

اس کے بعد ایک فلم میں یہ گانا سنا ۔اداکارہ نہایت ہی دردناک آواز میں صدا لگا رہی تھی ۔ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ حقیقی زندگی میں بھی اتنا ہی مایوس ہو گی ۔ جانے تھی یا نہیں ، لیکن اس کی اداکاری اپنی انتہا کو چھو رہی تھی ۔

لیکن یہ سب تو آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں ہیں جن کا تذکرہ میں لے بیٹھا جبکہ مجھے تو آج ہفتہ پہلے اختتام پذیر ہونے والے اولمپک کھیلوں کی بات کرنی تھی ۔

کون جیتا کون ہارا ؟ کس نے کتنے تمغے لئے ؟ کسے سونے کا تمغہ ملا اور کون کانسی کے تمغے سے بھی محروم رہا ۔ اس بارے میں نہیں بلکہ کیا اولمپک کھیلوں سے برازیل نے اپنی معشیت کے بارے میں جو امیدیں لگائیں تھیں وہ پوری ہوئیں

یا نہیں ؟

مجھے اپنے ایک مضمون کی یاد ستا رہی ہے جس میں ، میں نے برازیل کے لئے کئی خواب دیکھے تھے۔ میں نے لکھا تھا کہ 2012 میں اپنے ملک کے انتخابات میں دو بار صدر منتخب ہونے کے بعد اس اولوالعزم شخصیت لولا ڈی سلوا نے تیسری بار انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن اپنی دو بار کی صدارت کے دوران اس عظیم سربراہ مملکت نے اپنے ملک کو نہ صرف آئی ایم ایف کے قرضوں سے نجات دلائی بلکہ الٹا آئی ایم ایف کو اپنا مقروض بنا دیا۔ دنیا کی دس مضبوط معاشی قوت برازیل ساتویں نمبر پر آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ لولا ڈی سلوا کی محنت ۔فراست۔ ذہن کی بلندی اور دانشمندی کے سب ہوا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ لولا ڈی سلوا پر ایک الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت میں شاہراہوں کی طرف توجہ نہیں دی اور اس کے دور میں یہ پہلو مدھم ہی رہا لیکن اس نے اقتدار چھوڑتے وقت یہ بھی تو کہا تھا کہ میں تمہیں ایک تحفہ دے کر جا رہا ہوں اور وہ ہے اولمپک کھیلوں کا تحفہ جو تمہارے ملک میں 2016 میں منعقد کئے جائیں گے۔ حکومت کی بساط پر اسے نہایت ہی چابک دستی سے کھیلنا۔ ترقی ہی ترقی ہوگی شاہرائیں بھی بنیں گی۔ ریلوے اسٹیشن کے معیار بھی صحیح ہونگے اور ہوائی اڈے بھی۔ بین الاقوامی معیار کے قائم ہو جائیں گے۔ کیا لولا ڈی سلوا نے جو خواب دیکھے تھے کیا انکی تعبیر ملی ؟

نہیں -- جواب یہ ہے

لولاڈی سلوا کے بعد آنے والے حکمران اس قدر زیرک نہیں تھے جتنا کہ لولاڈی سلوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مضبوط معشیت جو لولاڈی سلوا نے اپنے ملک کے حوالے کی تھی اس کے اقتدار سے ہٹنے کے فورا بعد ہی زوال پذیری کی طرف گامزن ہو گئی تھی

لا محالہ اس کے اثرات ان اولمپک کھیلوں پر بھی پڑے۔ اولمپک کھیلوں کے منتظمیں بھی تاریخ میں پہلی مرتبہ نت نئے مسئلوں کا شکار ہوئے۔ کھیلوں کے اختتام سے ایک دن قبل اولمپک کھیلوں کے صدر تھامس بیش نے کہا کہ پہلی مرتبہ براعظم جنوبی امریکہ میں یہ اولمپک کھیل منعقد کئے گئے۔ ریو برازیل کی انتظامیہ ایک بہت بڑے اقتصادی بحران کا شکار تھی چنانچہ مختلف امور کی تکمیل کے دوران پیسوں کے بہت سے مسائل اٹھے۔ ذرائع نقل و حمل یعنی ٹرانسپورٹ کے لئے ہمیں الگ سے محنت کرنی پڑی۔ دوسری طرف برازیل کی ابتر سیاسی صورتحال کے سبب کھلاڑیوں کی حفاظت کے مسائل بھی دل کو دہلا دینے والے تھے۔ آئے دن کے ہنگاموں کے سبب ہماری تیاریاں بھی کچھ صحیح طریقے سے نہیں پنپ سکیں۔ لیکن اس کے باوجود اولمپک کھیلوں کی انتظامیہ سب مسئلے حل کرانے کی جد و جہد میں لگی رہی۔ ان کے نائب نے ایک موقع پر کہا کہ یہ سب ایسے

مشکل حالات تھے جو آج تک اولمپک کھیلوں کے منتظمیں کو کہیں بھی نبٹنے نہیں پڑے تھے۔

اولمپک کھیلوں کے سربراہ نے شکایت کی تھی کہ کھلاڑیوں اور مہمانوں کی حفاظت کے انتظامات کے معاملات بھی گھمبیر تھے۔ دراصل ملک کے معاشی حالات وہ نہیں رہے تھے جو سابق صدر لولوڈی سلوا کی حکومت چھوڑ کر گئی تھی۔ اب لوگوں کا معاشی حال پتلا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور ان حالات مین جرائم کی شرح میں اضافہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ وہ شاہراہ جو ہوائی اڈے کو اولمپک سٹی سے جوڑتی تھی وہاں کے حالات نہایت دگر گوں تھے۔ یہ شاہراہ ایسے علاقے سے گزرتی تھی جہاں نہایت کم آمدنی والے افراد رہتے تھے یا دوسرے الفاظ میں یہ وہاں کی کچی بستی کے علاقے تھے۔ جرائم پیشہ افراد نے ان علاقوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ایک مرتبہ اولمپک کھیل شروع ہونے سے ڈیڑھ ماہ پہلے انہوں نے کوئی واردات کی تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ان کے پاس ایسے ہتھیار تھے جو کہ برازیل کی فوج کے پاس بھی نہیں تھے۔ اس شاہراہ کی لمبائی 21 کلومیٹر کے قریب تھی۔ یہاں پر کچھ علاقے تو خود ساختہ طور پر 'علاقہ ممنوع' یا نو گو ایریا بنا لئے گئے تھے۔ تقریباً روزانہ ہی پولیس کا ان مجرموں سے مقابلہ ہونا ایک عام سی بات ہو گئی تھی۔

امن وامان کی صورت حال دیکھنے کے لئے یہ اس ویب سائٹ کو وزٹ کیجئے

http://www.dailymail.co.uk/news/article-3646384/Rio-s-highway-terror-Shooter-takes-aim-cars-Red-Line-road-Olympic-athletes-fans-travel-games-Brazil.html

اولمپک گاؤں جو اولمپک میں شرکت کرنے والے مہمانوں اور کھلاڑیوں کی شرکت کے لئے بنایا گیا تھا کھیلوں کے اختتام کے بعد اب خالی ہو چکا ہے۔ بلاشبہ لولا ڈی سلوا نے ایک اچھا خواب دیکھا تھا کہ ان فلیٹون کو بعد میں برازیل کی عوام کے لئے رہائشی منصوبوں اور مختلف کمپنیوں کے دفاتر میں تبدیل کر دیا جائے گا اور اسطرح عوام کے رہائشی مسائل حل ہو جائیں گے۔

لیکن یہ خواب بھی پورا ہوتا نہیں دکھائی دے رہا۔ لاطینی امریکہ میں جائیدادوں کا کاروبار کرنے والوں کی ایک تنظیم کے سربراہ نے کہا کہ پوری دنیا میں اس قسم کے منصوبوں کے لئے مختلف بیرونی کمپنیاں منصوبے کے آغاز سے پہلے ہی اپنی پیش کشیں دینا شروع کر دیتی ہیں لیکن ملک کے بگڑے معاشی حالات اور تباہ شدہ امن وامان کے سبب ایسی کوئی صورتحال پیدا ہوتی نہیں دکھائی دے رہی۔ ایسے لگتا ہے کہ ہم ایک کنوئیں میں ہیں اور باہر نکلنے کا راستہ سمجھ نہیں آرہا۔

آج سے چھ سال قبل جب لولا ڈی سلوا کی حکومت تھی، ملک کی مضبوط معاشی صورتحال کے سبب، سرمایہ کاروں کو سرمایہ لگانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں

محسوس ہو رہی تھی - اس زمانے میں بکنگ کھلنے کے ایک ہی گھنٹے کے اندر فلیٹوں کے سودے تکمیل پا رہے تھے حالانکہ اس وقت شرط یہ تھی کہ اولمپک کھیلوں کے اختتام پر ان کا قبضہ دیا جائے گا- اب قیمتیں بھی گر چکی ہیں لیکن پھر بھی خریدار نہیں مل رہے- لوگوں کو خریداری پر آمادہ کرنے کے لئے نئے نئے پیکیجز اور مراعات کا اعلان کیا جارہا ہے لیکن کامیابی کی کوئی کرن نہیں دکھائی دے رہی -

لولاڈی سلوا نے جتنے مہمانوں کی آمد کا اندازہ لگایا تھا ان کا پورا ہونا اس صورت حال میں ممکن نہیں تھا- چنانچہ اولمپک کے کئی منصوبے ادھورے ہی چھوڑ دیئے گئے تھے- اب ان کا کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا- ارد گرد نجی تعمیراتی ادارے' ان سرکاری اداروں کی نسبت کم قیمت پر اپنے منصوبے بیچ رہے ہیں اور حکومتی رہائشی منصوبوں کی قیمت زیادہ پڑ رہی ہے -

دنیا میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں کے سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اولمپک کھیلوں کے لئے تعمیر کی گئی کئی عمارتیں اب بے کار کھڑی ہیں اور زمانے کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتی نظر آتی ہیں- چین میں اولمپک کھیلوں کے لئے تیار کردہ اسٹیڈیم پرندے کے ایک گھونسلے کی شکل میں بنایا گیا تھا- ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران اس کا نظارہ کرتے ہیں تو ایک لحظے کے لئے تو

انسان مبہوت ہی ہو جاتا ہے۔ بچے تو ایک دم چلاتے ہیں 'مما مما-اب اس میں سے چڑیا نکلے گی " لیکن یہ خوبصورت اسٹیڈیم کسی اور مصرف میں نہیں لایا جا سکا- آخر تنگ آ کر چینی حکومت نے اسے سیاحت کے لئے استعمال کرنے کا سوچا اور اب اسے اسے سیاحت گاہ بنا کر عوام کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ اس سے کتنی آمدنی ہوتی ہے اس سے قطع نظر یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس کی دیکھ بھال پر ہی ہر ماہ آٹھ سے دس کروڑ روپے خرچ ہو جاتے ہیں -

گریٹ لولا ڈی سلوا کو سلوٹ کہ اسے اس بات کا ادراک تھا- اس نے پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا کہ اپنے ملک برازیل میں ایسا نہیں ہونے دے گا اور وہ ایک ایک عمارت کو لوگوں کی فلاح و بہبود کے استعمال میں لائے گا- اس نے ابتدا ہی میں اولمپک کھیلوں کے منتظمین سے بات کر لی کہ ان عمارات کی ساخت و ڈیزائن اس قسم کی بنائی جائے گی کھیلوں کے اختتام پر وہ آسانی سے تبدیل ہو کر دوسرے کام میں استعمال ہو سکیں- اس سے پہلے کبھی کسی نے اس امر کی طرف توجہ نہیں دی تھی- نہ اولمپک والوں نے اور نہ ہی کسی ملک نے- لیکن افسوس یہ خواہش بھی مٹی میں ملتی نظر آ رہی ہے- یہ ٹھیک ہے کہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہاں عمارات آسانی سے دوسرے مقاصد میں تبدیل کرنے سہولت زیادہ ہے لیکن اس کے لئے بھی تو پیسہ درکار ہے اور حکومت کی حالت یہ ہے کہ اس کے پاس پیسہ ہی نہیں

سینکڑوں ارمان لیکر آئے تھے۔ دل میں لاکھوں حسرتیں لے کر چلے

سوال یہ اٹھتا ہے کہ برازیل کی نئی حکومت اتنی جلدی ناکام کیوں ہو گئی ؟ نذیر ناجی اسی قسم کے ایک سوال کا جواب اپنے ایک کالم 22 جولائی 2007 میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ --- انقلابی نظام چلانے کے لئے مطلوبہ افرادی قوت چاہیئے ہوتی ہے---- ہم دیکھتے ہیں کہ لولا ڈی سلوا ایسا نہیں کر سکے۔ نیز ان کی صحت بھی اس قابل نہیں رہی تھی ۔ کہ وہ خود مزید چار سال حکومت کرتے

مولانا وحیدالدین صاحب کہتے ہیں کہ حکومت چلانے کا کام بہتر افراد کے تیار کرنے کے مرحلے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ کام لمبی مدت تک کے لئے جاری رہے۔ لولا ڈی سلوا کو ایسی مملکت ملی تھی جسکی کوئی چیز بھی سلامت نہیں تھی چنانچہ وہ ان ہی کاموں میں مصروف رہے اور اس اہم پہلو کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے

قبل از مسیح تاریخ میں ایک مثال حضرت موسیٰ کی ملتی ہے جنھوں نے رعمسیس کی فوج کو شکست دی۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اقتدار نہیں سنبھالا اور اور اپنے

قبیلے کو لیکر دوسرے مقام پر چلے گئے ۔اپنے قبیلے کی تربیت کرتے رہے جب انہوں نے سمجھ لیا کہ اب وہ افرادی قوت ان کے پاس ہے جو ان کے انقلابی مشن کی تکمیل کر سکتی ہے تب وہ اپنے مفتوح علاقے میں پھر آئے اور اس نئی افرادی طاقت کی مدد سے (حکمرانی کی ۔ (حوالہ کتاب 'فکر اسلامی' صفحہ 189- وحیدالدین خان

موجودہ زمانے میں اس کی مثال جاپان کی ہے جو دوسری جنگ عظیم میں تباہ ہو گیا تھا ۔ انہوں نے فاتح ملک سے صرف ایک ہی چیز مانگی کہ تعلیم کا شعبہ ان سے نہ چھینا ۔ جائے اور اسی تعلیم کے ذریعے انہوں نے ایسے ذہن اور انسان ترقی دئے جن کے دلوں ۔ میں ولولہ تھا ۔ اور آج کامیابی سے ہم کنار ہوئے

ایک صاحب کسی اخبار میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس مرتبہ اولمپک کھیلوں میں وہ جوش ، وہ ولولہ نہیں تھا جو ماضی کا وطیرہ تھا ۔ وہ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ یہ عالمی سطح پر پھیلی ہوئی بے چینی اور بدامنی تھی جو ان کھیلوں کو محدود پیمانے پر لے آئی ۔ اولمپک کھیلوں کی مشعل جو ماضی میں دنیا کے تمام ملکوں میں گھمائی جاتی تھی اسی سبب سے نہیں گھمائی گئی ۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ۔ اگر برازیل کے حالات صحیح ہوتے یہ مشعل دنیا بھر میں گھمائی جاتی ۔ سوہنیا کو کا کولا پلادے کی بجائے ؛سوہنیا ریو وچ کو کا کولا

پلادے کے نغمے فضاؤں میں بکھر رہے ہوتے ۔ مختلف اقسام کی مصنوعات جو اولمپک کے لئے سرکاری طور پر منتخب کی گئی ہوتی دن رات ان کے اشتہار ٹی وی پر نظر آرہے ہوتے اولمپک سے پہلے اس کا تعارف کرانے کے لئے اس کے کھلاڑی مختلف ملکوں کے ۔ دورے کرتے اور نمائشی میچ کھیلتے ۔ غرض ایک جوش ہوتا۔ ایک ولولہ ہوتا۔ لیکن برازیل کے حالات کے سبب یہ سب کچھ نہ ہو سکا.

میں نے دو سال پہلے ہماری ویب میں جو مضمون لکھا تھا اسے یہاں ملاحظہ کر سکتے ہیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=52928

وہ مسرت اب چہرے پر نظر آ رہی تھی

صابر--- یہ تھا ان صاحب کا نام جو ہمارے محلے میں رہتے تھے- - یہ تقریباً پانچ عشرے یعنی پچاس سال قبل کی بات ہے-

گھر کا رہن سہن دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ روکھی سوکھی کھا کر خاموشی سے اس خاندان کے افراد زندگی کے دن گزار رہے ہیں- بچے جب باہر کھیلنے آتے تو پتہ چل جاتا تھا کہ کپڑے نئے چمکدار نہیں لیکن صاف ستھرے اور اجلے ضرور ہیں-

پھر خاندان میں کچھ ایسے مسائل در آئے کہ غربت صابر خان کے دروازے پر دستک دینے لگی- صابر خان کے والد کسی مرض کا شکار ہو کر پلنگ کے ہو رہے- ادھر دفتر میں بھی کسی غلطی کے سبب صابر خان کی تنخواہ میں کمی کر دی گئی- دودھ والے نے محلے میں لوگوں کو بتایا کہ گھر والوں نے دودھ کی مقدار میں کمی کر دی ہے- بچے جو پہلے کسی جگہ ٹیوشن پڑھنے جاتے تھے وہاں سے نکال کر کسی کم فیس والے ٹیوشن سینٹر میں داخل کر دیا گیا- محلے والوں نے بھی یہ دستک سن لی تھی- کچھ نے سنکر ان سنی کر دی تھی اور کچھ نے سن کر قران سنا کیا اور اس

۔ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ اس خاندان سے تعاون کرنے لگے

عید قربان آئی۔ قربانی ہوئی۔ لوگ صابر صاحب کے گھر خصوصی طور پر گوشت لے جا کر دیتے رہے۔ ۔مجھے یہ محسوس ہوا کہ گوشت پہنچتا تو ایک حقیقی مسرت کا تاثر صابر خان کے چہرے پر عیاں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوشی کا اظہار ضرور کرنے کی ۔ کوشش کرتے۔ لگتا تھا کہ کچھ پریشانی لاحق ہے

وہ کیا شے ہے جو چہرے پر مسرت لائے گی ؟ میں اس وقت چودہ پندرہ برس کا تھا۔ میں ۔ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا

اچانک ایک بچہ عمر چھ سات سال ، جو ساتھ والے گھر میں رہتا تھا مجھے بلانے آیا کہ ۔ امی بلا رہی ہیں

میں چلا گیا۔ "بیٹا منیر۔ یہ کھال لے جا کر صابر خان کے گھر پہنچا دو۔" میں نے کھال اٹھائی۔ کافی بھاری تھی اور اس کے ساتھ ہی جو بوری تھی وہ بذات خود بھی بہت بھاری تھی۔ اس زمانے میں میں پٹ سن کی بنی ہوئی بوریاں استعمال کی جاتی تھیں۔ خیر میں نے لے جا کر کھال صابر خان کے گھر پہنچائی اور بوری واپس اس کے مالک کے گھر پہنچائی

۔

جب میں قربانی کی کھال صابر خان کے حوالے کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ مسکراہٹ آئی ہے اور اس عالم میں ہونٹوں کی دہلیز پار کرنے میں ناکام ہو گئی ہے اور صرف ہونٹ ہلتے ہی رہ گئے۔ لیکن چشم نمیدہ نمیدہ تھی۔ آخر آنسو کا ایک قطرہ آنکھ کے کونے میں آکر ٹک ہی گیا اور ستارہ بن کر چمکنے لگا۔ لرزیدہ ہاتھوں سے کھال وصول کی۔

کوئٹہ ان دنوں ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ میں مارکیٹ چوک کے پاس گذر رہا تھا۔ صابر خان نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کھال تھی۔ وہ کسی سے اس کا مول تول کر رہے تھے میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ صابر خان کو کافی پیسے مل گئے تھے۔ ۔ صابر خان قریب ہی واقع دواؤں کی دکان یعنی میڈیکل اسٹور گئے۔ اور دوائیاں خریدیں ۔ مجھے یاد آیا کہ صابر خان کے والد کئی دنوں سے بیمار تھے ۔

۔ وہ مسرت جس کا میں صابر خان کے چہرے پر متلاشی تھا اب نظر آ رہی تھی

عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر جگہ گوشت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ٹی وی پر مذاکرے

ہوتے ہیں کہ اس کی تقسیم کیسے کی جائے۔ ریڈیو سے اس بارے میں پند و نصائح نشر کئے
جاتے ہیں لیکن کھال کی بابت کم ہی بات کی جاتی ہے۔ ذرا اس کا بھی سوچیں۔ آج کل
امتحانات کے نتائج آ رہے ہیں۔ بچوں کو داخلے کے لئے۔ کتابوں کے لئے۔ مختلف
فارموں کے لئے۔ نئی یونی فارم کے لئے۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر جانے کے لئے
پیسوں کی ضرورت ہے۔ ایسے افراد کو قربانی کی کھال پہنچا کر ان کے مالی مسائل حل
کئے جا سکتے ہیں۔

وہ ایک سمندر تھے - مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

ستمبر کا اختتام ہے- تیسرا ست روزہ شروع ہو چکا ہے- موسم میں بھی تبدیلی کے آثار ہیں- صبح سویرے خنکی کا احساس ہوتا ہے- کچھ پھولوں کا سیزن ختم ہو رہا ہے اور کچھ نئے قسم کے پھول کھل رہے ہیں- یہ پھول اصرار کر رہے ہیں- یہ موسم ضد کر رہا ہے کہ اسلام کی عالم فاضل شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمت اللہ علیہ - بانی جماعت اسلامی- کا تذکرہ کیا جائے جو اسی ماہ کے تیسرے ست روزے یعنی 25 ستمبر 1903 کو اورنگ آباد حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور 76 برس کی عمر میں اسی تیسرے ست روزے یعنی 22 ستمبر 1979 کو امریکہ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے -

وہ ایک سمندر تھے

علم و حکمت کے اجالوں کا- شعور و آگاہی کی روشنیوں کا- دانش و فہم کی ضیاؤں کا - میں ہر سال کوشش کرتا ہوں کہ اس سمندر میں اتروں اور انکے بارے میں کچھ موتی چن کر لاؤں لیکن میں کہاں اور ان کی عظمت کہاں- ناکامی ہی میرے دامن میں آتی ہے- اور آج بھی یہی ہوا- اب میں نے یہی سوچا ہے کہ ان کی یادوں

کو ہی اپنی یاد میں لاؤں - - لوگ کیا کہتے ہیں وہی لکھ دوں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی دو مرتبہ زیارت کا موقع اچھرہ میں ملا- لیکن ان سے پہلی واقفیت کتاب 'پردہ' کی وساطت سے ہوئی- کتاب پڑھ کر میں دنگ رہ گیا کہ ایک بات کے حوالے دینے کے لئے آدھا صفحہ صرف کر دیتے تھے -

اسی پسندیدگی کے سبب ' میں نے انکی بے تحاشہ کتابیں پڑھ ڈالیں خصوصاً وہ کتب جو سوالًا جواباً تھیں- اسلام کے بارے میں کافی آگہی ملی- مولانا مودودی کے بعد مولانا وحید الدین کی کتب سے استفادے کا موقع ملا تو اسلام ایک دوسرے زاویئے سے آشکارا ہوا اور وہ امور جن کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کی کتب پڑھ کرتذبذب کا شکار تھا سے آگاہی ہوئی- آخر امام ابو حنیفہؒ نے بھی تو فرمایا تھا " جس پر ہم ہیں وہ ایک رائے ہے کسی کو اس پر مجبور نہیں کرتے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا قبول کرنا کسی پر واجب ہے- " اس کے باوجود مولانا مودودی کے علمی پہلو کو کسی بھی لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

ایک مرتبہ سنگاپور میں واقع کسی ویب سائٹ میگزین کو قارئین کے اسلام سے متعلق سوالوں کے جواب دینے کے لئے کچھ افراد کی ضرورت پڑی تو انہوں نے مطلوبہ افراد کے انتخاب کے لئے آن لائن کیمرے کے سامنے ایک ٹیسٹ کا انتظام

کیا۔ یہ اوپن بک ٹیسٹ تھا۔ (یعنی کتابیں کھول کر جوابات دیۓ جا سکتے تھے لیکن کسی سے پوچھنے کی اجازت نہ تھی) میں نے مولانا کی سب کتابیں اپنے سامنے رکھ لیں اور اس ٹیسٹ میں کمپیوٹر کا کیمرہ آن کر کے بیٹھ گیا۔ ان کے ٹیسٹ کا رزلٹ آیا تو کہا گیا کہ آپ کا ٹیسٹ دینے کا انداز دیکھ کر منتخب کیا جاتا ہے۔ لیکن سوالوں کے جواب اسی انداز میں اسی طرح حوالے دے کر دیا کریں۔ میرے علاوہ کچھ اور افراد بھی منتخب ہوئے تھے۔ قارئین کی طرف سے عموماً وہی عام قسم کے سوال ہوتے تھے جو کئی عشروں سے کئے جا رہے ہیں۔ تاہم ویب سائٹ کے ناظرین میرے جوابات سے مطمئن تھے۔ حالانکہ ان جوابات میں میرا کچھ حصہ نہیں تھا۔ یہ تو مولانا مودودی رحمت اللہ علیہ کی کتب سے حاصل کئے ہوئے جواب ہوتے تھے ۔

مولانا عبدالوحید خان بھارت کے سیاسی نظریات ' جماعت اسلامی سے مختلف ہیں لیکن وہ جماعت اسلامی کے ایک مخلص کارکن کی جد و جہد کا قصہ لکھتے ہیں ---

پاکستان بننے کے بعد بھارت میں جماعت اسلامی تقریباً ختم ھی ھو گئی تھی لیکن جو مخلص کارکنان تھے انہوں نے اپنی محبت ختم نہ کی ۔ انھی میں ایک نام عبدالغفار ندوی کا ھے ۔ مولانا وحیدالدین خان کہتے ہیں کہ انکی مولانا عبدالغفار ندوی سے 1948 میں

ملاقات ہوئی تھی۔ پورے لکھنو میں جماعت اسلامی کے وہ واحد رکن تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی جماعت کا اجتماع کروایا کرتے تھے۔ اور وہ اکیلے ہی اس میں شریک ہوتے تھے۔ خود ہی جماعت اسلامی کی کتاب پڑھتے اور خود ہی سنتے۔ ان کی اکیلی ذآت کے سوا وہاں کوئی ممبر ہی نہ تھا۔ جب مولانا وحیدان مولانا عبدالغفار ندوی سے ملاقات کو گئے تو وہ اسی قسم کے اجتماع کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مولانا عبدالغفار ندوی نے ان سے بھی اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔ مولانا وحیدالدیں اس اجتماع کے لئے رک گئے۔ اس اجتماع میں اس روز دو افراد نے شرکت کی ایک مولانا وحید الدیں خان اور دوسرے مولانا عبدالغفار ندوی۔ مولانا ندوی نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی کسی کتاب کا ایک حصہ پڑھا۔ اجتماع میں اضافے کا اللہ کے حضور میں شکر ادا کیا اور یوں اجتماع اختتام کو پہنچا۔

آج (1994) لکھنو میں جماعت اسلامی کے پانچ اجتماعات ہوتے ہیں ان میں شرکاء کی تعداد اب ڈیڑھ ہزار تک جا پہنچی ہے

(حوالہ الرسالہ دسمبر 1994 صفحہ 34)

میں نے ان کا تذکرہ بطور اسکالر یا عالم کے کیا ہے۔

لیکن جب سیاست کے میدان میں ان کے بارے میں قلم چلانے لگتا ہوں تو قلم ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے اور میں خود بھی۔ بہتر ہے کہ اسے نہ ہی چھیڑوں۔ چنانچہ سیاست کے چٹیل، بے آب و گیا میدانوں سے نکل کر ان کے علم سے لہلہائے ہوئے پھولوں کے تختوں پر چلتے ہوئے ان کے لئے دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا ہوں

قلم کی بغاوت

پھر ایک روز قلم چلتے چلتے رک گیا -

میں نے پوری کوشش صرف کردی کہ یہ دوبارہ لکھنے لگے لیکن ناکام رہا۔ میں بڑا پریشان ہوا کیوں کہ کہانی بڑی طویل تھی اور میں ابھی چند صفحات ہی اونچی پگ والے چوہدری رب نواز کی بیٹی کی رسم مہندی کے بارے میں لکھ سکا تھا -

میں نے قلم دوبارہ زور سے جھٹکا اور لکھنے کی سعی کی لیکن بے سود۔ میں قلم پھینک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ مجھے بہت پیارا تھا۔ میں اس سے سولہ کے قریب ناول لکھ چکا تھا اور یہ سب ہی خوب مقبول ہوئے تھے۔ میرے ناولوں کا موضوع عموماً نوابوں کے بیٹوں کی رسم عقیقہ ' اونچے خاندانوں میں شادی بیاہ کی رسومات اور انکے ثروت و حشمت کے واقعات ہی ہوا کرتے تھے۔ میرے قلم نے آج تک بے وفائی نہیں کی تھی لیکن آج نہ جانے کیوں اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے قلم ایک جانب رکھ دیا اور چوھدری رب نواز کے گھر میں منعقد ہونے والی رسم مہندی کا حال پڑھنے لگا -

مہندی کے موقع پر زمیندار نے اپنے دل کے سارے ارمان نکالے تھے۔ اپنی اونچی حویلی کو نئے سرے سے رنگ و روغن کروایا تھا۔ خوبصورتی بڑھانے کے لئے شہر کی اعلیٰ درجے کی نرسری سے تیار درخت منگوا کر لگائے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ درخت عشروں سے یہاں پر لگے ہوئے ہیں۔ باغ میں درآمد شدہ گھاس قطعوں کی صورت میں لگوائی جسکا سبز رنگ لہلہاتے پھولوں کے پس منظر کے ساتھ ایک عجب بہار دے رہا تھا۔ کچھ مقامات پر مصنوعی پہاڑیاں بھی تخلیق کی گئیں تھیں جس میں اس کی کوٹھی ایک نہایت ہی خوبصورت دل کو موہ لینے والا سماں پیش کر رہی تھی۔ جیسے جنت کا ایک ٹکڑا یہاں لا کر رکھ دیا گیا ہو۔ حویلی کو شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا۔ اونچی اونچی ہلکے رنگ والی قناعتیں۔ ہوا میں پھڑ پھڑاتی ہوئی نیلی پیلی جھنڈیاں۔ فضا کی بلندیوں میں اونچے اڑتے ہوئے غبارے' بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ رنگ و خوشبو کا ایک سیلاب امڈ ایا ہے۔ بچے خوشی سے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ "کمی" لڑکیاں سر جھکائے تیزی سے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے گزر جاتی تھیں

اتنا بڑا انتظام سنبھالنے کے لئے کمیوں کو خصوصی طور پر بلایا گیا تھا۔ شرفو کی بیٹی کا انتقال اسی روز ہوا تھا لیکن وہ بھی وہاں موجود تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ چوھدری اگر خوش ہو جائے تو اسے زیادہ دانے مل جائیں گے ۔ دادو بھی بھاگا بھاگا دیگیں اٹھانے میں مدد دے رہا تھا۔ اس کی بیوی کی زچگی ہونے والی تھی لیکن وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چوھدری کے گھر پہنچا تھا

کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس گاؤں میں اس کی خوشی چوھدری کی خوشی میں مضمر ہے۔
۔ بوڑھا کریمو بھی اپنی کم سن بیٹی کو لئے آیا ہوا تھا

اندر حویلی میں ایک نہایت ہی وسیع و عریض کمرے میں فرش پر نہایت نفیس و قیمتی قالین بچھا ہوا تھا جس میں پیر دھنس دھنس جاتے تھے۔ قالین کی چاروں طرف بارڈر پر مہندی کے پتّے نہایت ہی نفاست سے کاڑھے گئے تھے۔ کئی بار تو شک ہوتا تھا کہ شاید اصلی ہی پتے پڑے ہوئے ہیں۔ایک دو بچوں نے تو اٹھانے کی بھی کوشش کی تھی۔
۔ چوہدری نے یہ قالین خاص طور پر آرڈر دیکر ایک شہرہ آفاق ایرانی فرم سے بنوایا تھا قالین کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا گلاب کا پھول بنا ہوا تھا۔ ۔اس پھول پر عطر چھڑکا گیا تھا۔ یہ عطر بھی خصوصی طور پر کسی بیرون ملک سے منگوایا گیا تھا۔ پھول پر پڑے ہوئے عطر کی خوشبو سے تمام کمرہ مہک رہا تھا۔ ایسی مہک جو بوجھ معلوم نہ ہو بلکہ ایک سکون کا احساس دلائے۔ اسی پھول کے اوپر دلہن جلوہ افراز تھی۔ دلہن کے ارد گرد اس کی سکھیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ کچھ کھڑکیوں پر پنکھے لگے ہوئے تھے جو اندر کی ہوا کو باہر پھینک رہے تھے چنانچہ اندر ماحول نہایت ہی خوشگوار تھا۔ دو سہیلیاں جو دلہن کی بہت ہی عزیز سہیلیاں لگ رہی تھیں ڈھولک بجا رہی تھیں اور باقی تالیاں بجا کر ساتھ دے رہی تھیں۔ ڈھولک بجانے والی لڑکیوں نے نہایت بھاری سونے کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ یہ انگوٹھیاں ہر چار تھاپوں کے بعد جب ڈھولک کی لکڑی سے

ٹکراتیں تو باقی سہیلیاں تالیاں بجانا روک لیتیں اس طرح ایک خوشگوار سی موسیقی پیدا ہو رہی تھی۔ پھر ایک سہیلی نے جس کی آواز میں فردوس کے پرندوں کی سی مٹھاس اور لوچ تھا گانا شروع کیا

ساڈی سکھی نے آج بابل دا وہیڑہ چھڈ دتا
اونوں ویکھ کے ساڈا خیال دلوں کڈ دتا

- اچھا نی بی بی' ایک طرف کی لڑکیوں لڑکیوں نے آواز بلند کی'

- ہاں نی بی بی' دوسری طرف کی لڑکیوں نے گانے کے انداز میں ہی جواب دیا'

گانے کا ردھم برقرار رکھنے کے لئے دونوں گروپوں نے 'نی' کو کافی طویل کھینچا تھا۔ ان کی آنکھوں سے اور چہرے سے شوخی خوب ظاہر ہو رہی تھی۔ اس طرح پورے ماحول میں خوشی و مسرت کی لہریں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سب نے مل کر دوبارہ گانا شروع کر دیا

ساڈی سکھی نے آج بابل دا وہیڑہ چھڈ دتا
اونوں ویکھ کے ساڈا خیال دلوں کڈ دتا

دلہن شرم سے مزید سرنگوں ہو گئی۔ اس کا دوپٹہ جس پر سونے کی تاروں سے ستارے بنے ہوئے تھے اس کے سر پر سے کھسک گیا۔ چوھدرائن نے بڑے پیار سے اس کا دوپٹہ درست کیا۔

اچانک ایک بچی بھاگی بھاگی آئی۔ دس کے قریب اس کا سن ہو گا۔ساٹن کے نیلے کپڑے
۔ پہنے۔ سر پر سرخ ربن باندھے ہوئے وہ ایک گڑیا کی مانند لگ رہی تھی
چوھدرائن نے اسے دیکھا تو ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے بچی کو ایک تھپڑ رسید
کیا

' نی توں کدھر مری چلی آ رہی ہے۔ چل ہٹ پرے ہو۔ قالین خراب کر دے گی'
یہ کریمو کی بیٹی تھی۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آ گئے
کاجل جو اس نے صبح بڑے چاؤ سے لگایا تھا چہرے پر پھیل گیا اور وہ اداس چہرہ لئے ۔
۔ واپس مڑ گئی

اچانک شور مچ گیا۔ دلہن کا ہاتھ مہندی لگانے کے لئے باہر نکالا گیا۔ اس کی نازک
نازک گوری کلائیوں پر سونے کی چوڑیاں چمک رہی تھیں اور ایک نفیس جڑاؤ دار
" ۔ ۔ ۔ ۔ انگوٹھی اس کی انگلی میں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی
۔ اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا قلم ایک دم چلتے چلتے رک گیا
میں نے دوبارہ قلم اٹھایا اور اسے آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھنے لگا۔ مجھے

یوں محسوس ہوا۔ ہاں یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے اپنی سرخ آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ جیسے وہ کسی بات پر غصے ہو رہا ہو۔

میں نے سہم کر قلم نیچے کر لیا اور جھٹکے دینے لگا۔ اچانک قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا بلکہ اس نے خود ہی اپنے آپ کو چھڑایا تھا۔ نہ جانے اس میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

'ٹھہرو' ایک تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور خوف کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔

'یہ میں تمہارا قلم بول رہا ہوں' ۔ میں نے چونک کر قلم کیطرف دیکھا۔ ۔ اس کی لال لال سرخ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں جو کھڑا ہوا تھا اب خوف کے عالم میں دوبارہ بیٹھ گیا

'تم --- تم سرمایہ داروں کے کی وجاہت و ثروت کے قصے بیان کرتے نہیں تھکتے' قلم نے کہنا شروع کیا 'دولت مندوں کی جاہ و حشمت کا تذکرہ کرتے وقت زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہو۔ غریبوں کا خون چوسنے والے نظام اور اس کے پیروؤں کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللساں رہتے ہو لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس جہاں میں مزدور بھی رہتے ہیں جن کے ماتھے پر ابھرے پسینے کے قطروں

سے سرمایہ دار اور کارخانہ دار کے سونے کے موتی بنتے ہیں۔ اسی دنیا میں درانتی لئے ہوئے کسان بھی نظر آتا ہے جس کی درانتی کا ہر ایک دانت زمیں دار کے لئے سونا کاٹتا ہے۔ لیکن اس کی قیمت اس مزدور اور کسان کو کیا ملتی ہے ---- صرف کمی' کمتریں' و ذلیل کے القاب --- کبھی سوچا ہے تم نے' قلم نے زور دار آواز میں کہا۔ میں تھوک نگل کے رہ گیا اور سر جھکا لیا۔ 'مجھے بتاؤ اس اس غریب بچی کا کیا قصور تھا جسے چوہدرائن نے تھپڑ مارا تھا۔ تم نے اس بچی کا قصہ درد کیوں نہیں بیان کیا کہ منگنی سے ایک روز پہلے اپلے تھاپنے کے بعد وہ شام ڈھلنے تک نہر کے کنارے' برگد کے پیڑ تلے' ایک کُھردرے پتھر کی مدد سے اپنے ہاتھوں کو رگڑتی رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھاتی اور ناک کے قریب لے جا کر زور سے سونگھتی کہ کہ اس میں گوبر کی بدبو تو نہیں اور پھر دوبارہ پتھر اٹھا کر رگڑنا شروع کر دیتی اس کے بعد اس نے اپنے پیر رگڑنا شروع کئے اور جونہی اس کے سفید ملائم نازک پیر نمودار ہونے شروع ہوئے اس کے چہرے پر شادمانی کی جھلک آ گئی۔ ڈوبتے سورج کی لال لال روشنی اس کے دمکتے ہوئے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی خوش تھی اور جھوم جھوم کر اپنے پیر صاف کر رہی تھی۔ اس وقت وہ کنول کا ایک پھول لگ رہی تھی جو صبح کے وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں مسرت سے لہرا رہا ہو۔ نسیم سحر میں اب ایک بھینی بھینی سی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔

اور جب چوہدرائن نے اسے تھپڑ مار کر نکال دیا تو وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ چوہدرائن نے اسے کیوں نکالا۔ اس نے تو پیر کے میل کی تہیں اچھی طرح صاف کی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں بو بھی تو نہیں تھی

کاش تم اسے بتاتے اے پیاری بچی تم نے پیر سے تو مٹی کی تہیں دور کر دی تھیں لیکن کیا تم نے اپنے چہرے پر جمی ہوئی کمیں ہونے کی تہیں بھی صاف کی ہیں۔ جب تک تم یہ تہیں دور نہیں کرتیں اس وقت تک تمہیں اس قالین پر چلنے کا اختیار نہیں--- اس وقت تک یہ دنیا تمہاری نہیں اس چوہدرائن کی ہے-- جاؤ --پہلے یہ تہیں دور کر دو یا پھر کسی سے پوچھو کہ خدا نے تمہارے دل میں ارمان کیوں پیدا کئے۔ اگر ارمان دئے تو کمیں کیوں بنایا

کیا تم نے اسے یہ بتایا----------بولو---جواب دو

نہیں' میری آواز کسی گہرے کنوئیں سے نکلتی ہوئی سنائی دی'

تم بتاؤ گے بھی کیوں۔ تم دانشور۔ ادیب۔ شاعر-- سب ہی اس استحصال میں شریک' ہو۔ تمہیں غریب کی کیا پرواہ--- اسی لئے میں نے آج بغاوت کر دی ہے تا کہ تمہیں صحیح راہ دکھاؤں '

- میں خاموش رہا

کیا تمہیں شرفو پر بھی رحم نہیں آیا- جو جوان بیٹی کا غم سینے سے لگائے چودھری کی' خوشی میں شریک ہونے آیا تھا- محض اس لئے کہ چند دانے بچ جائیں اور اس کے باقی ماندہ بال بچوں کا پیٹ بھر سکے- اس کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا- آنکھیں اشک بہانے کے لئے بے تاب تھیں- دل زار زار رو رہا تھا لیکن وہ چوہدری کو دکھانے کے لئے ہنس رہا تھا کہ اس کی دکھ بھری ہنسی میں اس کا سکھ پنہاں تھا- اور جانتے ہو اس کی بیٹی کیوں مری تھی- اس کے علاج کرانے پیسے نہیں تھے- وہ ڈاکٹر کے قدموں پر گر پڑا تھا لیکن ڈاکٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا- اس نے چوہدری کے آگے ہاتھ جوڑ دئے تھے 'چوہدری صاحب رحم کرو- میں دانے نہیں لوں گا- مجھے اس وقت پیسے دے دو- میری بیٹی مر رہی ہے ' لیکن چوہدری غباروں میں پیسے اڑا سکتا تھا- آتش بازی میں پیسے جلا سکتا تھا لیکن کسی مجبور انسان کو نہیں دے سکتا تھا -

اور تم نے اس دادو کا ذکر کیوں نہیں کیا جسکی بیوی موت اور زیست کی سرحد پر کھڑی ہے لیکن دادو اسے چھوڑ کر دیگیں اٹھا رہا ہے- ڈھول کی آواز میں بھی دادو کو اپنی بیوی کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کر

کے اپنے ضمیر کو مار کر کام میں جتا ہوا ہے ۔

تم انہیں کیوں نہیں بتاتے کہ تمہاری بیٹیاں یوں ہی مرتی رہیں گی ۔ تمہاری بیویاں ایسے ہی چلاتی رہیں گی ۔ تمہاری بچیاں اسی طرح دھکے دے کر نکالی جاتی رہیں گی جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہو جاتا

لیکن تم تو منگنی کی تعریف میں کھوئے ہوئے تھے ۔ تمہیں اس کا خیال بھی کیوں کر آتا ۔ تم سب کچھ دیکھ رہے ہو لیکن خاموش ہو ۔ تمہارے سامنے مزدور نان شبینہ سے محروم کئے جا رہے ہیں ' دہقانوں سے دانے چھینے جا رہے ہیں ۔ مریض موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں ۔ شیر خوار بچے دودھ کو ترسائے جا رہے ہیں ۔ لیکن تم آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟ کیا یہ جھوٹ ہے ؟ --- قلم کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی ۔

ہاں ۔ ہاں ۔ تم صحیح کہہ رہے ہو ' میں چیخ پڑا اور سامنے سے اوراق اٹھا کر ٹکڑے ' ٹکڑے کر دئے اور دہقانوں کا افسانہ لکھنے لگا ۔ قلم آسانی سے چلنے لگا

اوراق کے ٹکڑے ہوا میں اڑ رہے تھے اور ان کے پیچھے مسکراتی ہوئی بچی نظر آئی ۔ ۔ وہ گندم کی بالیاں اٹھائے چلی جا رہی تھی